یاخدا
قدرت اللہ شہاب

قدرت اللہ شہاب

سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور

مہاجرین کے نام

جو ابھی بقیدِ حیات ہیں

لیکن تم ان کی زندگی کا شعور نہیں رکھتے

ترتیب

اس کہانی کی کہانی

ستمبر 1947ء کا مہینہ تھا اور ہندوستان سے لُٹ پُٹ کر آنے والے مجروح قافلوں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ جو پہلے آ گئے تھے وہ بعد میں آنے والوں کے انتظار میں ہزاروں کی تعداد میں واہگہ بارڈر پر کھڑے رہتے تھے۔ کسی کی ماں، کسی کا باپ، کسی کا بھائی اور کسی کا بیٹا، واہگہ پار کی بے کراں پہنائی میں گم تھا۔ اکثر کا یہ انتظار موہوم ثابت ہوتا۔ بعضوں کو فقط اپنے پیاروں کے جانگزا انجام کی خبر ملتی۔ کچھ خوش قسمت ایسے بھی تھے کہ خستہ و خراب عزیزوں کو پا لیتے تھے لیکن کم۔ مایوس و نامراد منتظرین کے چہروں کی خستگی دیکھنے کی ہوتی تھی۔

میں بھی انتظار کرنے والوں میں تھا۔ اپنے چچا زاد بھائی نعمت اللہ شہاب کا انتظار کرتے کرتے میری آنکھیں پتھرا گئی تھیں۔ نعمت اللہ میرا چچا زاد بھائی ہی نہ تھا، لنگوٹیا دوست بھی تھا۔ جس کے ساتھ چمکور کے سکول میں، مَیں نے کیا کیا دھومیں نہ مچائی تھیں۔ اب وہ ایک دیہاتی سکول میں انگریزی کا ماسٹر تھا اور اپنی سُبک نین نقشے والی بیوی کے ہمراہ کہیں بچھڑ

کے رہ گیا تھا۔ وہ زندہ تھا یا کشتوں میں شامل ہو گیا تھا یا کسی کیمپ میں پڑا ایڑیاں رگڑ رہا تھا' مجھے کچھ خبر نہ تھی۔ بہرحال مجھے اس کا انتظار تھا۔ یہ آس کا رشتہ بھی خوب ہے۔ ٹوٹ کر بھی نہیں ٹوٹتا۔ آخر وہ ایک روز آیا' لیکن میں اسے نہ پہچانا۔ لوگوں کو متجسّس دیکھتا ہوا میں اس کے پاس سے دو تین بار گزر گیا' آخر اُس نے خود مجھے 'قدرت' کہہ کر آواز دی۔

یہ نعمت اللہ کوئی اور تھا' اس ہنس مکھ البیلے جوان کی جگہ ایک صدیوں کا ماندہ ہڈیوں کا ڈھانچ۔ لباس خون آلود' چہرہ غبار آلود —— مَیں نے پوچھا —— ''نعمت! بھابی کہاں ہے؟'' وہ رو دیا اور اپنے پاس بیٹھی عورت کی طرف اشارہ کیا۔ اس عورت کا چہرہ داغ داغ تھا۔ صبیح چہرے کی کھال جیسے جلتی ہوئی آہنی سلاخوں سے داغ دی گئی ہو۔ ہوا بھی یہی تھا۔ اس ہمت اور غیرت والی خاتون نے اپنا چہرہ خود داغا تھا تاکہ کیمپ میں آنے والے شکاریوں کی نظرِ ہوس سے محفوظ رہے۔ وہ چہرہ نہ داغتی تو اس وقت واہگہ کے اس پار نہ ہوتی اور اب تک غالباً اس کا سارا جسم دغ چکا ہوتا —— نعمت اللہ کا یہ عالم اس طرح ہوا کہ چند سُورماؤں نے کیمپ کے کنوئیں میں نیلا تھوتھا گھول دیا تھا۔ بعضے اس آبِ حیات کو پی کر کیمپوں میں زندہ جاوید ہو گئے' نعمت اللہ ان میں سے تھا جن کی آنتیں اس مشروب سے کٹ کر رہ گئیں —— نعمت اللہ اسی روز —— اس ارضِ موعود میں پہنچنے کے چند گھنٹے بعد بارِ حیات اتار کر سُبکسار ہو گیا۔ وہ عفیفہ' اس کی بیوی تیسرے روز چل بسی اور مَیں جو اتنے دنوں سے منتظر

تھا۔ خالی ہاتھ کراچی واپس آگیا۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں لارنس روڈ کے ایک بنگلے میں رہتا تھا۔ رات بھر اس کی روشنیاں جلتی رہیں اور رات بھر میں بیٹھا یہ کہانی لکھتا رہا۔ نعمت اللہ کی کہانی ـــــ اپنے گاؤں چمکور کی کہانی۔ اپنے گاؤں کے ملّا علی بخش کی بیٹی دلشاد کی کہانی۔ کیمپوں کا حال جو میں نے لکھا ہے' لاہور میں دیکھا۔ مہاجر بہنوں کا شکار کرنے والے بہت سے بھائی جن کے چہرے 'یا خدا' میں نظر آئیں گے۔ مولوی' خدام خلق' قوم کے لیڈر اور سیاست داں' سبھی اصلی کردار ہیں۔ مَیں نے ان کے نام نہیں لکھے۔ ان میں ایک صاحب کو تو خدا نے وزیرِ مملکت بھی بنایا۔ خدا جسے چاہے جو عزّت دے دے اس کی مصلحتیں وہی جانے۔

اس کہانی کا انجام بھی میرے ذہن نے نہیں سوچا۔ اسے میری گنہگار آنکھوں نے کراچی کے عید گاہ میدان میں دیکھا جہاں بے خانمانوں نے ڈیرے ڈال رکھے تھے۔ یہیں دلشاد' یا اس نام کی عورتیں مجھے پکوڑے تلتی' بیچتی نظر آئیں۔ ساتھ والی سے کہا۔ ''بہن ذرا میرے بچے کا دھیان رکھنا' میں بیسن لے آؤں۔'' اور کسی کے ساتھ بیسن لینے چل دیں۔ یہ پکوڑے برسوں تلے جاتے رہے اور بکتے رہے' شاید اب بھی ان میں سے باقی ہوں۔ یہ بچے اب تیرہ چودہ برس کے ہونہار قلی' مزدور یا بھک منگے' اس ارضِ موعود کے شہریوں میں شامل ہیں۔

1947ء ابھی ختم نہیں ہوا۔

اس کہانی کی کہانی بھی ختم نہیں ہوئی۔

کراچی کے بعد میرا تقرر لاہور میں محکمہ صنعت کے ڈائریکٹر کے طور پر ہوا۔ ایک روز ڈاک میں ایک پھٹا پُرانا پیلا لفافہ مجھے ملے۔ سواد تحریر قطعی طور پر اجنبی تھا۔ مَیں نے کھولا' یہ ایک لڑکی کی داستان تھی جو یکہ و تنہا بے یارومددگار اچھرہ کے قریب مہاجرین کی جھونپڑیوں میں رہتی تھی۔ اس نے لکھا کہ میرا جسم داغا گیا لیکن میں اس پار پہنچ گئی۔ یہ دھرتی میرے لیے فردوس کی سرزمین اور یہاں مسلمان مجھے شفیق بھائی دکھائی دیتا تھا لیکن یہ بھائی ہوس ناک شکاری نکلے۔ انہوں نے میری جو خاطرمدارت کی ہے' اس کے طفیل مَیں تپ دق کی مریض ہوں اور میرے بہت دن باقی نہیں تھوڑا پڑھی لکھی ہوں۔ "یا خُدا" کہیں سے مل گئی تھی میں نے پڑھی مجھے یہ کہنا ہے کہ میں دلشاد بن کر بھی دلشاد نہ بن سکی۔ میں ان مجبوروں میں سے ہوں جو ہنسی خوشی پکوڑے نہیں تل سکتیں۔ بیسن نہیں لا سکتیں اور اس پاک سرزمین میں سینکڑوں شاید ہزاروں کی تعداد میں موجود ہیں۔

میرے پاس ایک لمبی سی شورلیٹ کار تھی۔ اُن دنوں اس کی قیمت سستی اور شان زیادہ تھی ـــــ اسے مَیں نے ان جھونپڑیوں سے دور سڑک پر چھوڑا' اور پوچھتا پچھاتا ڈھونڈتا ایک ٹاٹ کی جھگی میں پہنچا وہاں ایک ویران آنکھوں والی' میلے کچیلے کپڑوں میں ملبوس بیٹھی تھی۔ لڑکی کیا تھی راکھ کا ڈھیر یا چوبِ خشک صحرا ـــــ لگا کے آگ جسے کارواں روانہ

ہُوا۔

راستے میں کوئی زیادہ باتیں نہیں ہوئیں۔ ایک بار اس لڑکی نے لمبی آہ بھری، اور کہا شہاب صاحب۔ مَیں اس سے زیادہ لمبی اور چمکیلی کاروں میں سوار ہو چکی ہوں جن دنوں یہاں کیمپ میں تھی اور انھی کاروں میں واپس کیمپ میں پہنچ جاتی تھی۔

اس لڑکی کا علاج ہو گیا۔ اسے ایک چھوٹا سا مکان بھی مل گیا اور تھوڑا بہت روزی کا وسیلہ بھی ہو گیا اور میرے ذہن سے یہ واقعہ نکل گیا اور میں ایک بار پھر کراچی میں ایک نوکری پر چلا گیا۔

ایک روز میرے چپڑاسی نے ایک کاغذ کا پرزہ لا کر دیا کہ ایک صاحب آپ سے ملنا چاہتے ہیں، ان کے ساتھ ایک برقعہ پوش خاتون بھی ہیں۔ نام ان صاحب کا میرے لیے اجنبی تھا۔ مَیں نے انہیں اندر بلایا اور کہا معاف کیجئے میں آپ کو پہچانا نہیں۔ ان صاحب نے مسکرا کر اس برقعہ پوش خاتون کی طرف اشارہ کیا جس نے اب نقاب الٹ دیا تھا۔ یہ ایک چمپئی رنگ کی شعلہ رخسار خاتون تھی۔ اس نے کہا، مَیں اچھرہ کی جُھگی میں رہنے والی دلشاد ہوں جو دلشاد نہ بن سکی، یہ میرے میاں ہیں۔ اور میں آپ کا شکریہ ادا کرنے آئی ہوں کیوں کہ میں پھر زندوں میں ہوں۔

رات کو یہ لوگ میرے ہاں کھانے پر آئے۔ دوسرے روز پھر دس کروڑ آبادی میں گُم ہو گئے اور اس پر کئی سال گزر گئے۔

پچھلے دنوں —— ابھی چند ماہ پہلے کی بات ہے کہ میں صدرِ پاکستان کے ہمراہ مشرقِ وسطیٰ کے دورے کی ایک منزل دہران میں اُترا۔ یہ تیل کا مرکز ہے اور امریکہ کا ایک اہم فوجی اڈہ' یہاں حسب رسم ہمارا تعارف مقامی عہدہ داروں اور معززین سے کرایا گیا۔ انہی میں ایک صاحب پاکستانی تھے' ریشمی صافہ باندھے ہوئے' انہوں نے کہا شہاب صاحب آپ مجھے پہچانے؟ میں نادم ہوا تو بولے میں آپ سے کراچی میں ملا تھا اور یہ میری بیوی ہیں۔ انہیں آپ مجھ سے زیادہ جانتے ہیں۔

یہ وہی خاتون تھی لیکن اب پہچانی نہیں جاتی تھی۔ چہرے پر جوانی کے علاوہ خوشحالی کی آسودگی اور طمانیت کا نور تھا اس نے بتایا کہ اب ہمارا تین سال کا ایک بچّہ بھی ہے۔

اس کتاب کے لکھے جانے کے چودہ سال بعد مجھے یقین ہو گیا کہ موت کے بعد تو نہیں البتہ اس ارضی زندگی میں آواگون کا چکرّ ضرور چلتا ہے۔ زندہ انسان آخری موت سے پہلے کئی مرتبہ مرتا اور کئی بار نیا جنم لیتا ہے۔

کشتگاں خنجرِ تسلیم را ہر زماں از غیب جانے دیگر است

جب میں دلشاد کی زندگی کو مخالفانہ تنقیدوں کے پشتارے کے ساتھ تولتا ہوں جو اس کتاب پر چھپیں تو مجھے یہی زندگی بھاری نظر آتی ہے۔ بہت لوگ اس کتاب کے چھپنے پر مجھ سے ناخوش ہوئے اور مجھے بہت سے طعن سننے پڑے لیکن اس روشن بشاش اور صبیح چہرے کے مقابلے میں جو

مجھے دہران میں نظر آیا۔ ان کی کیا حقیقت ہے۔ اگرچہ اس نتیجے کو بھی میں ضمنی ہی سمجھتا ہوں۔ مجھے تو فقط اپنے یار جانی اللہ اور اس کی سُبک چہرہ بیوی کی کہانی لکھنی تھی جن کے انتظار میں مَیں ہفتوں واہگہ کے بارڈر پر کھڑا رہا۔ اور جن کی تلاش میں مَیں نے وہ سب کچھ دیکھا جو ہزار کوشش کے باوجود بھی میرا قلم پوری طرح لکھنے سے قاصر رہا۔

قدرت اللہ شہاب

یکم ستمبر1961ء

رَبَّ الْمَشْرِقَیْنِ

تری دُنیا میں مَیں محکوم و مجبُور

"اُس طرف کیا تکتی ہے، سالی؟ تیرا کوئی خصم ہے اُدھر؟"———

امریک سنگھ نے کرپان کی نوک سے دلشاد کی پسلیوں کو گدگدایا، اور بایاں گال کھینچ کر اُس کا منہ پچھم سے پُورب کی طرف گھما دیا۔

دلشاد مُسکرا دی۔ یہ مسکراہٹ اس کا خاصہ بن گئی تھی۔ بچپن میں اس کا کامیاب ترین ہتھیار اس کا رونا تھا۔ ایک ذرا سی ریُں ریُں، راں راں کر کے وہ ماں کے سینے میں چھپائے ہوئے دودھ سے لے کر الماری میں رکھی ہوئی برفی تک ہر چیز کو حاصل کر لیا کرتی تھی۔ اب جوانی نے اس کی مسکراہٹ میں اثر پیدا کر دیا تھا۔ اس نئے جادو کا علم اس کو اس وقت ہوا جب اس کی ایک مسکراہٹ پر نثار ہو کر رحیم خاں نے قسم کھائی تھی کہ اگر چاند یا سورج یا تارے بھی اسے اٹھا لے جائیں تو وہ ارض و سما کی وسعتیں پھاند کر اسے چھین لائے گا۔

رحیم خاں جھوٹا تھا۔ مکّار کہیں کا۔ آسمانوں کی بات تو دُور کی بات تھی وہ تو اسے زمین ہی پر کھو بیٹھا۔ دلشاد نظر بچا بچا کر قبلہ رو ہو بیٹھتی تھی اور خیال ہی خیال میں اپنی جبیں کو اس آستانے پر جھکا دیا کرتی تھی، جس

کے دامن میں رحمتوں اور نعمتوں کی ایک بے کراں دنیا پوشیدہ بتائی جاتی تھی۔ مغرب کی طرف کعبہ تھا۔ کعبہ اللہ میاں کا اپنا گھر تھا۔ اس گھر کا تصور دلشاد کے دل میں عقیدت اور امید کا ایک تابناک چراغ روشن کر دیتا تھا۔ لیکن امریک سنگھ کو پچھم سے نبے حد چڑ تھی۔ یُوں بھی سکھوں کی اس بستی میں چند رواج بڑے ٹیڑھے تھے' ایک کریلا دوسرے نیم چڑھا۔ بارہ سے بارہ بجے تک اُن کے اعصاب کمان کی طرح تنے رہتے تھے اور یوں معلوم ہوتا تھا گویا کسی نے بستی بھر کے بچوں' جوانوں اور بُوڑھوں کو بجلی کے تار میں پرو کر برقا دیا ہے۔

امریک سنگھ کا گھر مسجد کے عقب میں واقع تھا۔ اس مسجد کے دامن میں ایک بھیانک سا واہمہ پرورش پا رہا تھا۔ گاؤں بھر میں یہ بات پھیل رہی تھی کہ سرشام ہی مسجد کے کنوئیں سے عجیب عجیب ڈراؤنی آوازیں سنائی دینے لگتی ہیں —— جیسے دو چار بکریوں کو بیک وقت ذبح کیا جا رہا ہو۔

"سالا حرامی" امریک سنگھ کہا کرتا تھا۔ "مرنے کے بعد بھی ڈکرا رہا ہے' بھینسے کی طرح۔ ڈال دو کچھ ٹوکرے کوڑے کے کنوئیں میں۔"

"ارے چھوڑو بھی" امریک سنگھ کا بھائی ترلوک سنگھ مذاق اڑاتا تھا۔ "بانگ دے رہا ہے مُلّا بانگ۔"

"خالصہ جی کے راج میں دھرم کی پُوری پُوری آزادی ہے —— ہاں" گیانی دربار سنگھ جبڑے پھاڑ کر ہنستا۔

لیکن امریک سنگھ کی بیوی ڈرتی تھی۔ رات کو سناٹے میں جب مسجد کا کنواں گلا پھاڑ کر چنگاڑتا' تو اس کا تن بدن ٹھنڈے پسینے میں شرابُور ہو جاتا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے مّلا علی بخش کی تصویر آجاتی' جو مسجد کے حجرے میں رہا کرتا تھا' نحیف بدن' دو ہاتھ کی لمبی داڑھی' آنکھوں پر موٹے گلاس کا چشمہ' سر پر سبز ململ کی بے ڈھب سی پگڑی' ہاتھوں میں رعشہ' گردن میں اُبھری ہوئی رگیں۔ لیکن جب وہ صحن میں کھڑا ہو کے پانچ وقت اذان دیتا تو مسجد کے گنبد گونج اٹھتے اور علی بخش کے نحیف و نڈھال گلے سے وہ زنّاٹے کی آواز نکلتی جیسے بہت سی آبشاریں دست بداماں ہو کر گونج رہی ہوں۔

اذان کی آواز سے امریک سنگھ کی بیوی کو بڑی کوفت ہوتی تھی' ایک وقت یا دو وقت کی بات ہوتی تو خیر' لیکن جب دن بھر میں پانچ بار اسے یہی بول سننا پڑتے تو وہ گھبرا جاتی۔ اس نے بڑے بزرگوں سے سن رکھا تھا کہ اذان میں کالے جادو کے بول ہوتے ہیں اور جوان عورتیں اسے سُن کر "بانگی" جاتی ہیں۔ اگر بن بیاہی نوخیز لڑکی بانگی جائے تو اُس کے بانجھ ہونے کا ڈر تھا۔ اگر بیاہی ہوئی بیوی بانگی جائے تو اُس کے حمل گرنے لگتے تھے! چنانچہ امریک سنگھ کے گھر میں پشت ہا پشت سے یہ رسم تھی کہ ادھر اذان کی آواز فضا میں لہرائی ادھر کسی نے کٹورے کو چمچے سے بجانا شروع کیا۔ کسی نے چمٹے سے لڑایا۔ کوئی کانوں میں انگلیاں ٹھونس کر بیٹھ گئی' کوئی بھاگ کر پچھلی کوٹھڑی میں جا گھسی —— اور اس طرح

بہادر خاندان اپنی لاڈلیوں کی کوکھ کو کالے جادو کے اثر سے بچا کر ہرا بھرا رکھتا آیا تھا۔

امریک سنگھ کی بیوی کے بطن میں سوا لاکھ خالصے پرورش پا رہے تھے تھے۔ سکھوں کی گنتی میں ایک سکھ سوا لاکھ انسانوں کے برابر شمار ہوتا تھا۔ آدھی رات گئے جب مسجد کا کنواں امریک سنگھ کی بیوی کے تصور میں بھیانک اور ہولناک گونج بن کر ڈکارتا تو اس کے پیٹ میں خالصوں کی یہ بہادر فوج ہڑبونگ مچانے لگتی۔ کبھی اس کے کانوں میں کنوئیں کی چنگھاڑیں جگر خراش انداز سے گونجتیں۔ کبھی اس کے تصور میں کنوئیں کا دہانہ جبڑے پھاڑ کر اس کی طرف لپکتا اور ہر وقت اسے یہ دھڑکا سا لگا رہتا کہ مُلا علی بخش کنوئیں کی دیوار کے ساتھ رینگتا ہوا باہر نکل رہا ہے اور چشم زدن میں کنوئیں کی منڈیر پر کھڑا ہو کر نہ جانے کس وقت اسے "بانگ" کے رکھ دے گا۔

امریک سنگھ کی بہن کے بطن میں تو ابھی کسی خالصے نے اپنا گھر نہیں جمایا تھا۔ کیونکہ ابھی وہ بن بیاہی تھی، لیکن اس کے دل پر سوا لاکھ کا قبضہ تھا رات کو جب وہ اپنی چارپائی پر لیٹ کر ان میٹھی میٹھی گدگدیوں کو یاد کرتی جو مکئی کے کھیتوں کی اوٹ میں سوا لاکھوں کی بھوکی انگلیاں اس کے تن بدن کو چھلنی بنا کے رکھ دیتی تھیں تو اس کے سینے میں ارمانوں کا ایک ہجوم سا اُمڈ آتا اور وہ تصور میں اپنے جسم کو جوان جوان، قوی قوی خالصوں کے وجود سے آباد کر لیتی ——— لیکن پھر مسجد والے کنوئیں کی

دلدوز چنگھاڑ اس کے ایوان تصور کو مسمار کر کے رکھ دیتی اور معاً اسے
محسوس ہوتا کہ کنویں کی عمیق گہرائی سے بھی ملا علی بخش کالے جادو کے
بول پکار پکار کراس کے پیٹ سے چلنے والی نسلوں کے ناک کے بند کر رہا ہے۔

امریک سنگھ کو اپنی بیوی اور بہن دونوں پر غصہ آتا تھا۔ بزدل کی
بچیاں ملّا علی بخش تو کب سے دُور دفان ہو چکا تھا۔ جس روز وہ کنوئیں کی
منڈیر پر بیٹھا وضو کر رہا تھا۔ امریک سنگھ نے خود اُسے نیزے کی نوک پر
اچھالا' ترلوک سنگھ نے اُس کو اپنی تلوار پر آزمایا' گیانی دربار سنگھ نے اس
کے جھنجھناتے ہوئے خون آلود جسم کو تڑاخ سے کنوئیں میں پھینک ڈالا۔

ایک ملّا علی بخش ہی پر کیا منحصر تھا۔ اب تو چمکور کا سارا گاؤں صاف
ہو چکا تھا۔ بانگیں دینے اور سُننے والوں کا وجود ناپید ہو گیا تھا۔ کچھ بھاگ
گئے تھے' کچھ مر گئے تھے اور بہتوں کی گردن پر خالصوں کی مقدس کرپانیں
سجدہ ریز ہو چکی تھیں —— لیکن یہ ڈرپوک حرام زادیاں تھیں کہ اب
بھی وہی بانگوں کے ڈر سے اپنے بچہ دانوں کو چھپائے چھپائے پھرتی تھیں۔
چنانچہ جب امریک سنگھ کی بیوی اور بہن سوتے سوتے چیخ کر چھاتیاں پیٹنے
لگتیں تو اس کا دل طیش سے جل کر کباب ہو جاتا اور وہ چمٹا اٹھا کر انہیں
مار مار کر لہولہان کر دیتا۔ مارتے مارتے اس کے ہاتھ شل ہو جاتے' بازوؤں
میں تھکن آ جاتی' رگیں پھول جاتیں اور وہ اپنی گنجان داڑھی سے پسینے
کے قطروں کو جھاڑتا ہوا دیوانوں کی طرح لپک کر دلشاد کے پاس چلا جاتا۔
جس طرح دائمی زکام کا مریض دماغ کی ریزش کو ہلکا کرنے کے لیے وقتاً

فوقتاً نسوار سونگھ لیا کرتا ہے' اسی طرح گاؤں بھر کے خالصے اپنی وہم آلود بیویوں اور بہنوں سے بھاگ کر اپنے بدن کا فشارِ خون دھیما کرنے کے لیے دلشاد کے پاس چلے جایا کرتے تھے۔

دلشاد کو مسجد میں رکھا گیا تھا کیونکہ حجرے کی چھت جل جلا کر گر چکی تھی۔ یُوں تو اُس کے سرمائے میں جسم بھی تھا اور جان بھی۔ لیکن اس کا عزیز ترین سرمایہ اس کے ابا کی تسبیح تھی۔ ملّا علی بخش کے ہاتھ اسی تسبیح پر گھومتے گھومتے بوڑھے ہو گئے تھے۔ پتھر کے گول گول دانوں پر اس کی انگلیوں کے نشان نقش فریادی کی طرح پیوستہ تھے۔ سالہا سال کے گریہ نیم شبی اور فغان سحری کے آنسو اس تسبیح میں موتیوں کی طرح پروئے ہوئے تھے۔ یہی چند موتی تھے جن کے وجود سے دلشاد کا لٹا ہوا صدف ابھی تک آباد تھا ——— وہ دن بھر اس تسبیح کو گلے میں ڈال کر قمیض کے نیچے چھپائے رکھتی تھی لیکن شام پڑتے ہی اسے کسی ویران کونے میں دبا دیتی تھی' کیونکہ اسے ڈر تھا کہ کہیں بھنگ اور شراب میں سموئی ہوئی زبانیں اس کے ابا کی انگلیوں کے نقوش کو بھی چاٹ چاٹ کر ناپاک نہ کر دیں۔

آدھی آدھی رات گئے وہ مسجد والے کنوئیں کی منڈیر پر رویا کرتی تھی۔ اس کی آنکھیں کنوئیں میں ٹکٹکی لگائے پک جاتی تھیں کہ شاید کبھی اس کے ابّا کی تیرتی ہوئی پگڑی کی ایک جھلک اُسے دکھائی دے' اس کے کان کنوئیں کی طرف لگے لگے تھک جاتے تھے کہ شاید کبھی اس کے ابّا کی آخری سِسکی اسے ایک بار پھر سنائی دے یا وہ خوفناک چنگھاڑیں جنھوں نے

گاؤں بھر کی عورتوں کو پریشان کر رکھا تھا' شاید اس کے منتظر کانوں کو بھی نوازیں —— لیکن کنواں تاریک تھا اور قبر کی طرح خاموش۔ جب کوئی آوارہ چمگادڑ اس میں پر پھڑپھڑاتی' تو —— ہر پھڑپھڑاہٹ کے ساتھ بدبُو اور تعفن کے تیز تیز بھپکے فضا میں منتشر ہو جاتے تھے۔ کیونکہ سوا لاکھ بہادروں نے ملا علی بخش کا گلا مرنے کے بعد بھی بند رکھنے کے لیے کنوئیں کو غلاظت اور کوڑے کرکٹ سے اٹا اٹ بھر دیا تھا۔

دلشاد کا وجود ایک ٹوٹے ہوئے تارے کی طرح تھا کہ جس کے ٹکڑے آسمان کے ویرانوں میں اکیلے ہی اکیلے بھٹک رہے ہوں۔ آسمان کی بساط لُٹ چکی تھی۔ سورج اور چاند چھپ گئے تھے۔ تاروں کے چراغ بُجھ گئے تھے اور وہ اکیلی رہ گئی تھی۔ بے یارومددگار۔ مسجد کے دروازے کے ساتھ لگی ہوئی' سہمی ہوئی' حیران ---- لیکن اس کے دم سے مسجد پھر آباد ہو گئی تھی۔ لوگ باریاں باندھ باندھ کر وہاں آتے تھے اور جب وہ بہادر خالصے محراب کے نیچے بیٹھ کر شراب کا ادھیا کھولتے اور دلشاد کی بوٹیوں کو چچوڑ چچوڑ کر کھانے کی کوشش کرتے' تو گویا انہیں یہ فخر ہوتا کہ وہ گِن گِن کر ساڑھے تیرہ سو برس کی اذانوں اور نمازوں کا بدلہ چکا رہے ہیں۔

چمکور کی مسجد گوردواروں سے بھی زیادہ آباد ہو گئی تھی۔ رفتہ رفتہ گاؤں کی بیاہی ہوئی اور بن بیاہی ماؤں کو یہ احساس ستانے لگا کہ ملّا علی بخش کے بعد ملّا علی بخش کی بیٹی ان کی کوکھ لوٹنے پر تلی ہوئی ہے۔ وہ تو چھٹے کھا کھا کر اپنی چارپائیوں سے لگ کر سو جاتی تھیں لیکن ان کے بہادر

خالصے رات رات بھر دلشاد کے ساتھ اپنی آنے والی نسلوں کا سودا کیا کرتے تھے۔

امریک سنگھ، امریک سنگھ کا باپ، امریک سنگھ کا بھائی ——— ایک خالصے کے بعد دوسرا خالصہ، دوسرے خالصے کے بعد تیسرا خالصہ ——— رات بھر وہ نظریں بچا بچا کر، موقع جانچ جانچ کر مسجد کے آستانے پر حاضری دیتے تھے۔ بھُنی ہوئی کلیجی اور گُردے اُڑاتے۔ تلے ہوئے کبابوں کا دور چلتا۔ شراب اور بھنگ کی بالٹیاں بٹتیں اور اپنی نسل بندی کے وہ بیج جن کو ہرا بھرا رکھنے کے لیے ان کی بیویاں سَو سَو طرح کے جتن کرتی تھیں، وہ بلا دریغ مسجد کی چار دیواری میں بکھیر آتے ——— اور ایک دن بیٹھے بٹھائے یکایک دلشاد سرسوں کی طرح پھُول اٹھی۔ جب یہ خبر پھیلی گاؤں میں آگ سی لگ گئی۔ بیویوں نے چیخ چیخ کر اپنا سر پیٹ لیا۔ کنواری لڑکیوں نے رو رو کر آنکھیں سُجالیں اور مکئی کے کھیتوں میں چھُپ چھُپ کر اپنے خالصوں سے ملنا چھوڑ دیا۔ کنوئیں کی چنگھاڑیں تیز تر ہونے لگیں۔ گھروں میں فِٹ پر فِٹ آنے لگے۔ چمٹے پر چمٹے چلنے لگے، ایک کہرام سا مچ گیا۔

پہلے تو سب کی یہ رائے ہوئی کہ بچہ پیدا ہونے سے پہلے ہی دلشاد کو مار کے کنوئیں میں پھینک دیا جائے۔ لیکن پھر امریک سنگھ کو ایک مفید تجویز سوجھی۔ آم کے آم گٹھلیوں کے دام۔ ایک روز صبح سویرے وہ اسے اپنی بیل گاڑی پر بٹھا کے پاس کے تھانہ میں لے گیا اور اغوا شدہ مسلمان

عورتوں کی برآمدگی کے سلسلہ میں اپنی کوششوں کا عملی ثبوت دینے کے لیے دلشاد کو پیش کر دیا۔

تھانیدار لبھو رام نے امریک سنگھ کی کارگزاریوں کو خوب سراہا —— پولیس کی طرف سے شکریہ کا ایک پروانہ اسے عطا کیا اور ڈپٹی کمشنر بہادر سے بھی سند دلوانے کا وعدہ فرمایا —— پھر تھانیدار صاحب نے عینک اٹھا کر دلشاد کا جائزہ لیا۔ قبول صورت، جوان، ذرا پیلی سی، لیکن گرم گرم، گداز —— لیکن جب ان کی نظر دلشاد کے پیٹ پر پڑی۔ تو ان کی ابھری ہوئی اُمیدوں کو ایک زبردست دھکّا لگا۔ پہلے تو انھوں نے سوچا کہ اگر دس بیس دن کی بات ہو، تو وہ اسے ابھی تھانہ ہی میں رکھ لیں۔ لیکن جب ہیڈ کانسٹیبل دریو دھن سنگھ نے جوڑ توڑ کے حساب لگایا کہ ابھی "خلاص" ہونے میں تین ساڑھے تین مہینے باقی ہیں تو تھانیدار لبھو رام کو بڑی مایوسی ہوئی۔ پھر بھی رات کو کھانا کھا کر جب وہ ایک پتلی سی بنیان اور جانگیہ پہن کر چارپائی پر لیٹے تو انھوں نے دلشاد کو پاؤں دبانے کے لیے اپنے پاس بلا لیا۔ جاتے چور کی لنگوٹی ہی سہی۔ تھانیدار صاحب کے پاؤں کا درد بڑھتے بڑھتے پنڈلیوں میں آ گیا پھر گھٹنوں میں۔ پھر رانوں کے اندر، پھر کولھوں کے آس پاس —— اور وہ دلشاد کا ہاتھ پکڑ کر اپنی دُکھتی ہوئی رگوں کا درد دبواتے رہے۔ تھانیدار لبھو رام کے نزدیک خواہش کا دوسرا نام تسکین تھا۔ چناں ہوا تو کیا، چنیں ہُوا تو کیا؟

دلشاد کے لیے یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ پچھلے چند مہینوں میں اس

نے زندگی کے پیچ کچھ اسی طرح کھولے تھے کہ اس کے بدن کی بوٹی بوٹی گویا مرہم کا پھاہا بن کر رہ گئی تھی۔ جو کوئی اسے جہاں سے جی چاہتا لگا لیتا اور اس کے جسم کا ہر حصہ بھڑکتے ہوئے، ہانپتے ہوئے، بے چین انسانوں کو چند ہی لمحوں میں تسکین کا جام پلا دیتا تھا۔ لیکن اس کی اپنی رگ رگ میں کتنے پھوڑے تھے، کتنی ٹیسیں تھیں، کتنے رستے ہوئے زخم تھے، کاش! رحیم خاں ہوتا تو دیکھتا۔

دلشاد کو اپنے آپ پر بھی غصہ آتا تھا کہ اس نے بیچارے رحیم خاں کو اتنی بار ناحق مایوس کیا تھا۔ ایک روز جب اس نے اُسے زبردستی چومنے کی کوشش کی تھی تو دلشاد نے غصہ سے اُس کے سر پر ایسا دوہتڑ مارا تھا کہ اُس کی چوڑیاں ٹوٹ کر رحیم خاں کے ماتھے میں گڑ گئی تھیں، اور وہ خود ساری رات انگاروں پر لوٹتی رہی تھی کہ نہ جانے خدا اور رسولؐ رحیم خاں کو اس گناہ کی کیا سزا دیں گے؟ بیچارا رحیم خاں!

پندرہ بیس دن کے بعد جب تھانیدار لبو رام کے گھٹنوں اور کولہوں اور کمر کا درد ذرا کم ہوا تو انہوں نے دلشاد کو چھٹی دی اور ہیڈ کانسٹیبل دریودھن سنگھ کے ساتھ اسے انبالہ کیمپ بھیج دیا گیا۔ راستہ میں ہیڈ کانسٹیبل دریودھن سنگھ کے کولہوں اور گھٹنوں میں بھی کئی بار درد اُٹھا۔ لیکن دلشاد بڑی تندہی سے اس کے درد کا مداوا کرتی گئی اور دس گھنٹے کی مسافت انہوں نے دس بارہ دنوں میں بخیر و عافیت طے کر لی۔

انبالہ کیمپ میں بہت سی لڑکیاں تھیں، بہت سی عورتیں۔ جوان

بھی، خوبصورت بھی، لیکن ٹوٹے ہوئے تاروں کی طرح، کہ جن کے شرر بُجھ گئے ہوں، جن کی کہکشاں لُٹ گئی ہو، جن کی تیوریوں پر کیچڑ مَل دیا گیا ہو۔

ہر روز فوج کے ٹرک آتے تھے اور نئی نئی لڑکیوں، نئی نئی عورتوں کو انبالہ کیمپ میں چھوڑ جاتے تھے۔ ناموس اور تقدس کی تسبیح کے یہ بکھرے ہوئے انمول موتی پھر اپنے مرکز کی طرف جمع ہو رہے تھے۔ لیکن ابھی اُن پر اپنے "سبحان" اپنے "غفور الرحیم" اپنے "پاک پروردگار" اپنے "قادر مطلق" کی حمد کا وظیفہ شروع نہ ہوا تھا۔ بلکہ کیمپ کمانڈر میجر پریتم سنگھ اور اس کے جوانمرد سپاہی ابھی تک ان پر گرد کی بانی جپتے تھے۔ خیر دلشاد کو اب ایک قسم کی چھٹی تھی۔ یوں تو نیک اولاد ہمیشہ اپنے ماں باپ کا سہارا ہوتی ہے لیکن دلشاد کو اپنے ہونے والے بچے پر بڑا ہی بھروسہ تھا کہ اس نے پیدا ہونے سے پہلے ہی اپنی مجبور ماں کو اپنی حفاظت میں لے رکھا تھا۔

انبالہ کیمپ کے پہلو میں ریلوے لائن تھی۔ سورج کی روشنی میں ریل کی پٹڑیاں چاندی کے تار بن کر چمکتی تھیں اور دُور، بہت دُور مغرب کی طرف ان کی نقرئی لڑیاں خوابوں کے سہانے جزیروں میں گم ہو جاتی تھیں کہ ان کا دوسرا سرا مشرقی پنجاب میں نہیں مغربی پنجاب میں ہے! مغربی پنجاب!! مغرب کا خیال آتے ہی دلشاد کی راکھ میں ایک ننّھا سا چراغ ٹمٹما اُٹھتا۔

مغرب میں کعبہ ہے۔ کعبہ اللہ میاں کا اپنا گھر ہے۔ لیکن کیمپ کی

دوسری عورتیں کہتی تھیں کہ مغرب میں اور بھی بہت کچھ ہے۔ وہاں ہمارے بھائی ہیں، ہماری بہنیں ہیں، ہمارے ماں باپ ہیں۔ وہاں عزت ہے۔ وہاں آرام ہے —— دلشاد سوچتی تھی کہ شاید وہاں رحیم خاں بھی ہو! یہ خیال آتے ہی اس کے جسم کا رواں رواں مچل اٹھتا اور وہ بے چین ہو جاتی کہ پر لگا کر اڑ جائے اور اپنے تھکے ہوئے، دکھے ہوئے جسم پر اس ارض مقدس کی خاک مل لے۔

ہفتہ، دو ہفتے، مہینہ، دو مہینے —— دن گزرتے گئے۔ راتیں بیتتی گئیں، اور مغرب کا خوش آئند تصوّر دلشاد کے سینے میں اُمیدوں کا نور پھیلاتا رہا۔ انبالہ کیمپ کی آبادی بڑھتی گئی اور جب میجر پریتم سنگھ اور اس کے جوانوں کا دل اچھی طرح سیر ہو گیا تو ایک دن وہ ریل بھی آ گئی جس کے انتظار میں اُمیدوں کے چراغ ابھی تک جل رہے تھے جب وہ ریل کے ڈبے میں سوار ہوئی، تو دلشاد کو ملاّ علی بخش کی یاد آئی وہ بھی اسی طرح ریل میں بیٹھ کر حج کو روانہ ہوا تھا۔ گلے میں ہار تھے، کپڑوں پر عطر تھا اور گاؤں کے لوگ باجا بجاتے ہوئے اس کے ساتھ اسٹیشن تک آئے تھے ——!

ریل کے ہر فراٹے کے ساتھ عورتوں کے ٹوٹے ہوئے آبگینے جھنجھنا اُٹھتے تھے۔ پہیّوں کی ہر گردش کے ساتھ ان کے جسم اور رُوح کا ایک بل نکل جاتا تھا۔ جب وہ کھڑکیوں سے جھانک جھانک کر تار کے کھمبوں کو دیکھتیں جو بڑی سرعت کے ساتھ پیچھے کی طرف بھاگ رہے ہوتے، تو انہیں یقین سا ہو جاتا کہ وہ آگے ہی کی طرف جا رہی ہیں۔ زمین

کا جو چپّہ چپّہ ان کے نیچے سے نکلتا وہ انہیں مشرقی پنجاب سے اٹھا کر مغربی پنجاب کے قریب تر لے جاتا۔ اگر کہیں گاڑی رکتی' تو ساری کائنات دم سادھ لیتی۔ وقت کی رفتار ساقط ہو جاتی اور انہیں یہ ڈر لگتا کہ شاید انجن کے سامنے اچانک بڑے بڑے پہاڑ آ گئے ہیں۔ جب گاڑی دوبارہ چلتی تو دل کی دھڑکنیں جاگ اُٹھتیں' سینوں کے ارمان تازہ ہو جاتے اور وہ کھڑکی سے ہاتھ باہر نکال نکال کر اس ہوا کو چھونے کی کوشش کرتیں' جو مغرب کی سمت سے آ رہی تھی!

لدھیانہ' پھلور' جالندھر——امرتسر—— ہر منزل پر عورتوں کی زندگی کے بند کھلتے گئے۔ ان کی خاک میں سوئے ہوئے نغمے بیدار ہونے لگے۔ وہ گنگنانے لگیں۔ وہ مُسکرانے لگیں۔ وہ آنکھیں مَل مَل کر ایک دوسرے کو دیکھنے لگیں۔ جیسے کسی بھیانک خواب کو بھلانے کی کوشش کر رہی ہوں۔ کسی نے بالوں میں کنگھی کی۔ کسی نے دوپٹہ کے ساتھ دانتوں کی میل اُتاری۔ کوئی کپڑے جھاڑنے لگی۔ کوئی بچوں کو لوریاں سنانے لگی۔ کچھ عورتوں نے سر سے سر جوڑ کر گیت گائے۔ پیارے پیارے رَس بھرے' دلرُبا گیت' کہ "اے کالی کملی والے۔ مَیں تیری یثرب نگری میں آئی ہوں" —— "مجھے اپنی کملی میں چھپا لے۔ مجھے اپنے پاؤں کی خاک بنا لے ——

جب امرتسر کے اسٹیشن سے نکلی' تو کسی نے کہا کہ اب صرف ڈیڑھ گھنٹے کا سفر اور ہے۔ بس ڈیڑھ گھنٹہ اور! ساٹھ اور تیس' نوّے منٹ!

یہ ناقابلِ یقین خیال عورتوں کے تن بدن پر شراب کے تیز و تند نشے کی طرح چھا گیا۔ اپنی منزل کو اتنا قریب پا کر وہ شدّتِ احساس سے مفلوج سی ہو گئیں۔ پچھلے بھیانک مہینوں کی یاد زہر بن کر ان کے سینے میں عود کر آئی۔ ماضی کی ہولناک حقیقت مستقبل کے سہانے ارمانوں پر غالب آ گئی۔ یکا یک ان کو اپنے شاداب گاؤں یاد آنے لگے۔ اپنے جوان جوان بھائی اپنے نحیف نحیف ماں باپ، جن کے بے گور و کفن لاشے گلیوں میں پڑے سڑ رہے تھے۔ اپنی اُداس اُداس بہنیں جو کیمپوں میں بیٹھی فرشتوں کا انتظار کر رہی تھیں کہ وہ انہیں اپنے نوری پروں میں چھپا کر لے جائیں۔ دُور، کہیں بہت دُور، مغرب کی طرف ——— وہ رونے لگیں۔ ان کے گالوں پر آنسوؤں کے پرنالے بہنے لگے۔ دلشاد بھی رو رہی تھی، بلک بلک کر سِسک سِسک کر اور آنسوؤں کا نمکین پانی اس کے ہونٹوں پر پہاڑی چشموں کی طرح ابل رہا تھا۔ وہ روتی گئی، وہ روتی گئی اور اشکوں کی دبیز چادر نے اس کی پلکوں کو اپنے دامن میں چھپا لیا۔ ایک عجیب سی غنودگی، ایک عجیب سا خمار اس کے روئیں روئیں پر چھا گیا۔ اسے یوں محسوس ہونے لگا کہ وہ سمندر کی اتھاہ لہروں میں غوطے کھا رہی ہے اور بے شمار سنپولیے اُس کے تن بدن پر رینگ رہے ہیں ——— رینگ رہے ہیں!!

رَبَّ الْمُغْرِبَیْنُ

مری دُنیا میں تیری پادشاہی

جب اس کی آنکھ کھلی تو ریل کا ڈبہ خالی ہو چکا تھا۔ اسٹیشن کی ایک مہترانی ڈبے کے فرش کو پانی سے دھو رہی تھی۔ دلشاد کے پہلو میں ایک ننھّی سی بچّی رو رہی تھی۔ صبح کی فضا سورج کی کنواری کرنوں میں نہا رہی تھی درختوں پر چڑیاں پُھدک رہی تھیں۔ گھاس پر شبنم کے موتی چمک رہے تھے' اسٹیشن پر چہل پہل تھی۔ ایک گرم چائے والا کھڑکی کے پاس خوانچہ لگائے دودھ اُبال رہا تھا۔

دلشاد اٹھ کر کھڑکی کے سہارے بیٹھ گئی۔ اس نے نقاہت سے چائے والے سے پوچھا۔ ''کیا یہ مغرب ہے بھائی؟''

چائے والا اپنے پیلے پیلے کریہہ المنظر دانت نکال کر ہنسا ''کیوں؟'' کیا نماز پڑھو گی اس وقت؟''

اسٹیشن کی مہترانی جب ڈبے کے فرش کو دھو چکی تو اس نے اپنی محنت کے صلے میں دلشاد سے ایک چوّنی مانگی۔ پھر مایوس ہو کر اس نے دلشاد کو چند غلیظ گالیاں دیں۔ ''سارا ڈبہ پلید کر دیا رانڈ نے' ذرا صبر نہ ہو سکا؟ راستے ہی میں جن بیٹھی ——!'' سٹیشن کی مہترانی جا کر ایک مضبوط سے

مہتر کو اپنے ساتھ لے آئی اور دونوں نے مِل کر دلشاد کو ڈبے سے نکال دیا۔

پلیٹ فارم پر ایک سامان لادنے والا ٹھیلا کھڑا تھا۔ دلشاد اس کے ساتھ پیٹھ لگا کر بیٹھ گئی۔ سامنے چائے کا سٹال تھا۔ تانبے کے چمکدار سماوار سے اُبلتے ہوئے چائے کے بھبکے پیچ در پیچ نکل رہے تھے جیسے کسی نازنین کے گیسو ہوا کے دوش پر لہرا رہے ہوں۔ اس کے آگے پھلوں کی دوکان تھی۔ رنگ برنگ کاغذوں پر کندن کی طرح دمکتے ہوئے کیلے سنگترے اور مالٹے سجائے رکھے تھے۔ ایک کٹا ہوا سُرخ انار چھابڑی میں پڑا تھا۔ چھت کے ساتھ انگوروں کے بڑے بڑے خوشے لٹک رہے تھے دلشاد کا گلا کانٹے کی طرح خشک تھا۔ اس کی زبان پر گدلے گدلے، میلے میلے لعاب کی پپڑیاں جمی ہوئی تھیں۔ اس کے پیٹ میں ایک عجیب سا بخار سلگ رہا تھا۔ اس کی کمر میں درد کی ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں اور اس کا سارا بدن ایک دُکھتے ہوئے پھوڑے کی طرح چُر مُر کر رہا تھا۔

دلشاد نے اپنی خشک زبان ہونٹوں پر پھیری۔ اس کی ننھی سی بچی چوہیا کی طرح اس کے سینے سے چمٹے ہوئی چس چس دودھ پی رہی تھی۔ کبھی وہ سوچتی تھی کہ شاید وہ رات بھر سوتی ہی رہی اور مغرب کی سہانی منزل مقصود کو پیچھے چھوڑ آئی۔ کبھی اسے خیال آتا کہ شاید اسی سٹیشن کی فلک بوس عمارت کے پیچھے اس کا رحیم خاں اس کے انتظار میں کھڑا ہو یا شاید وہ لوگوں کے ان جمگھٹوں میں کھویا ہوا اسے تلاش کر رہا ہو جو پلیٹ

فارموں پر اِدھر اُدھر گھوم رہے تھے۔

وہ کوشش کر کے اٹھی' کہ لوگوں کے ہجوم کے قریب ہو جائے لیکن اس کے گھٹنے کٹاک سے بج کر رہ گئے۔ اس کی پنڈلیوں میں رعشہ سا آگیا اور وہ سر تھام کر ٹھیلے کے سہارے پھر بیٹھ گئی۔

دو خوش پوش' خوش شکل جوان لڑکے ہاتھ میں ہاتھ دیے پلیٹ فارم پر ٹہل رہے تھے۔ ایک سگریٹ پی رہا تھا۔ دوسرے کے پاس سگار تھا جب وہ دلشاد کے سامنے سے گزرتے تو دور تک پیچھے مڑ مڑ کر اُسے دیکھتے رہتے۔ رفتہ رفتہ ان کے چکر کی طوالت کم ہوتی گئی اور بالآخر وہ دلشاد کے عین سامنے کھڑے ہو گئے۔ دلشاد کا دل زور زور سے پسلیوں کے ساتھ ٹکرانے لگا۔ بیم ورجا کا ایک عجیب سا تانا بانا اُس کے دماغ پر چھا گیا۔

چمکور کی مسجد میں اگر کوئی اُسے گھور کر دیکھتا' تو وہ بے بسی کے عالم میں اپنا جسم ڈھیلا چھوڑ کے بیٹھ جاتی تھی۔ کیونکہ اسے معلوم تھا کہ اگلے لمحہ اسے گھورنے والے کے ہاتھ اُس کا گوشت نوچ کھسوٹ کر رکھ دیں گے۔ لیکن ریل میں بیٹھ جانے کے بعد اس نے ان خوشگوار توقعات کا سہارا پکڑ لیا تھا' جو مغرب کے تصوّر سے اس کے دل اور دماغ میں بسی ہوئی تھیں۔ اس لیے وہ سوچنے لگی' کہ شاید یہ خوبصورت جوان وہ مہربان بھائی ہوں' جن کے خون کی کشش انبالہ کیمپ کی عورتوں کو ہر لمحہ اپنی طرف کھینچا کرتی تھی۔ اس خیال سے دلشاد کے دل میں خوشی کی ایک لہری ناچی۔ وہ تو مسکرانا بھی چاہتی تھی۔ لیکن اس کے بدن میں درد کی ٹیسوں کا

طوفان سا اٹھا ہوا تھا اس لیے وہ باوجود کوشش کے بناوٹی طور پر بھی مسکرا نہ سکی۔ پھر بھی محبت کا جتنا لوچ اس کا دکھتا ہوا' رستا ہوا جسم اکٹھا کر سکتا تھا' اس نے اپنی آنکھوں میں سمیٹ کر ان نوجوانوں کی طرف بڑے پیار سے دیکھا۔

"انور!" ایک نوجوان سگریٹ کا دھواں دوسرے کے مُنہ پر چھوڑ کر گرمجوشی سے مسکرایا۔

"رشید" دوسرے نوجوان نے گرمجوشی کا جواب گرمجوشی سے دیا۔

انور! رشید!! دلشاد گویا سرشار ہو گئی۔ یہ دو نام اس کے کانوں میں آبِ حیات سا ٹپکا گئے۔ مہینوں سے وہ ایسے مانوس نام سننے کے لیے ترس گئی تھی۔ اس کے گاؤں کے انور' رشید' محمود' نسیم' خالد' جاوید تو مدت سے مٹ گئے تھے۔ ان کی جگہ اس کے تصوّر میں اب شمشیر سنگھ' امریک سنگھ' کرتار سنگھ' ترلوک سنگھ' پنجاب سنگھ' سورمکھ سنگھ اور دربار سنگھ کے نام اژدھوں کی طرح لہراتے تھے۔ ان ناموں کا زہر اس کی رگ رگ میں خون کی طرح سرایت کر چکا تھا۔ ان کی سڑاند اس کے روئیں روئیں میں بسی ہوئی تھی۔ اُن کا وحشی اُبال اس کی ہڈیوں میں درد بن کر رچا ہوا تھا لیکن اب جو اس کے کانوں نے رشید اور انور کے نام سنے' تو اسے یوں محسوس ہوا' جیسے وہ آبِ کوثر سے نہا رہی ہو۔ جیسے وہ پاک و مصّفا پانی اس کے گلے ہوئے' سڑے ہوئے جسم پر گلاب اور کافور کی خوشبوئیں چھڑک رہا ہو ـــــــ ان کی گری ہوئی گردن میں افتخار کا اُبھار آگیا۔ اس کے

مایوس اور غم دیدہ سینے میں اُمید و مسرت کی کرنیں پھوٹ اٹھیں اور اس نے ہاتھ کے اشارہ سے اُن دو نوجوانوں کو اپنے قریب بلایا۔

"یہ کیا جگہ ہے بھائی؟" دلشاد نے پوچھا۔

"لاہور ہے۔" انور نے کہا۔

"تم کہاں جاؤ گی؟" رشید نے پوچھا۔

"جہاں قسمت لے جائے۔"

"باپ رے باپ!" انور نے رشید سے سرگوشی کی۔

"بڑی سپورٹ ہے بھائی!" رشید نے انور کو آنکھ ماری۔

"آؤ بہن، تم ہمارے ساتھ چلو۔" دونوں ہم زبان ہو کر بولے۔

جب دلشاد ٹھیلہ کا سہارا لے کر اُٹھی تو اس کے بھائیوں کو پہلی بار اپنی ننھی سی بھانجی کی جھلک دکھائی دی۔

"ارے" انور حیرانی سے اُچھلا۔

"یہ کیا بلا ہے؟" رشید نے پوچھا۔

"لڑکی ہے جی۔" دلشاد کچھ ہچکچائی، کچھ شرمائی۔

"بڑی چھوٹی سی ہے۔" انور نے جائزہ لیا۔

"ایک ہی دن کی ہے جی۔" دلشاد آخر بھائیوں سے کیا کہے، کیا نہ کہے۔

"آخ تھو" انور کو ابکائی سی آئی۔

"لاحول ولا قوۃ" رشید کا جی متلایا۔

وہ دونوں بھائی قے کرتے کرتے بچے، اور تیز تیز قدم وہاں سے چلے گئے۔ سامنے والے پلیٹ فارم پر ایک خوبصورت عورت بھڑکیلی سی شلوار اور قمیض پہنے جا رہی تھی۔ اس کا دھانی دوپٹہ اس کے سڈول شانوں پر لہرا رہا تھا۔ رشید اور انور نے چھلانگیں مار کر ریل کی پٹڑی کو عبور کیا اور ہاتھوں میں ہاتھ دیے اس خوبصورت عورت کے تعاقب میں چل کھڑے ہوئے۔

دوپہر کے وقت سٹیشن کی رونق ذرا ڈھل گئی۔ دھوپ میں تمازت کا اثر بڑھ گیا اور مہربان سورج کی کرنیں دلشاد کے دکھتے ہوئے جسم کی ٹکور کرنے لگیں۔

ایک انگریز اپنی میم کے ساتھ پلیٹ فارم پر دھوپ سینک رہا تھا ان کا چھوٹا سا لڑکا دلشاد کے قریب اپنے کتّے سے کھیل رہا تھا۔ جب اُس نے دلشاد کی ننھی سی لڑکی کو دھوپ میں لیٹے ہوئے اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھ پاؤں مارتے دیکھا، تو اس کی آنکھیں فرطِ حیرت سے پھیل گئیں اور وہ خوشی سے چیختا ہوا بھاگا اور اپنی ماں کو یہ عجوبہ دکھانے کے لیے گھسیٹ کر لے آیا۔

"ہاؤ ونڈر فل، ممّی، ہاؤ ونڈر فل!" بچّہ چیخ رہا تھا اور حیرت اور مسرت سے اس کی آنکھیں پھٹی جاتی تھیں۔

دلشاد کی بیٹی ایک پھٹی سی چادر میں لپٹی ہوئی اپنے ننھے ننھے گھونسے تان کر آسمان کو دکھا رہی تھی اور اس کے چھوٹے چھوٹے پاؤں ارض و سما

کی کونین کو اپنی ٹھوکروں سے دھتکار رہے تھے۔ انگریز کا بچہ اس ننھی سی چیز کو دیکھ دیکھ کر تالیاں بجاتا تھا۔ ناچتا تھا اور ہر لمحہ کوشش کرتا تھا کہ وہ اُچک کر اس جاندار کھلونے کو اپنے ہاتھوں میں اٹھا لے۔ اس کی ماں نے اسے ڈانٹا کہ دوسرے کی چیز کو ہاتھ نہیں لگایا کرتے۔ لڑکا مچل گیا۔

"ہم تم کو ایسا ہی کھلونا لا دیں گے۔" لڑکے کے باپ نے اُسے چمکارا ـــــــ "جھوٹ" لڑکا رو رہا تھا۔

"ہاں، ہاں بچے، ہم ضرور تم کو ایسا ہی کھلونا لا دیں گے۔" لڑکے کی ماں نے وعدہ کیا۔

"تم کب مجھے ایسا ہی کھلونا لا دو گے؟" لڑکا بات پکّی کرنا چاہتا تھا۔

"بہت جلد، میرے بیٹے، بہت جلد۔" باپ نے اپنی بیوی کے گاؤن کا جائزہ لیا۔ جس کی گولائی پیٹ کے اُوپر بہت پھیلی ہوئی تھی۔ بیوی نے شرما کر منہ پھیر لیا۔

"ممّی! اس کھلونے کو چاکلیٹ دو!"

"نہیں بیٹے، یہ چاکلیٹ نہیں کھا سکتی۔"

"اچھا تو ممّی، اسے ایک عمدہ سا سوٹ دو۔"

"ہاں میرے ڈارلنگ، ہم اسے کپڑا دیں گے۔"

"اور پیسے بھی، میری ممّی!"

"ہاں، پیسے بھی میرے ڈارلنگ۔"

لڑکا خوشی سے چیخ چیخ کر پھر تالیاں بجانے لگا اور جب اس کا جی اس

کھیل سے بھر گیا تو اُس کی ماں نے دلشاد کو اُونی کپڑے کا ایک ٹکڑا اور پانچ روپے دیے۔ جب وہ جانے لگے' تو دلشاد نے دل ہی دل میں اس بچّہ کو دعا دی' جو پہلی بار اس کی زندگی میں رحمت کا فرشتہ بن کر نازل ہوا تھا۔

جب دلشاد کے ہاتھ میں پیسے آ گئے' تو دنیا کے ساتھ اس کا رشتہ از سرِ نو قائم ہو گیا۔ ایک چائے والے نے اس کے پاس آ کر "گرم چائے" کی ہانک لگائی۔ ایک "گوشت روٹی" والا بھی اس کے نزدیک اپنا خوانچہ لے آیا۔ اور جب دلشاد روٹی کھانے لگی تو ایک کتّا بھی زبان نکال کر اس کے سامنے آ بیٹھا۔

قریب ہی ایک بنچ پر دو بزرگ بیٹھے رائے زنی فرما رہے تھے۔ ایک کی داڑھی سفید تھی' دوسرے کی حنائی۔ دونوں کچھ دیر سے انگریز اس کی میم اور بچّے کی حرکات پر ناک بھُوں چڑھا رہے تھے۔ جب میم نے دلشاد کو اونی کپڑا اور پانچ روپے خیرات دیے' تو ان دونوں بزرگوں کو یہ محسوس ہوا کہ اس فرنگن نے ان داڑھیوں کو پکڑ کر زور سے جھٹک دیا تھا۔

"لاحول ولا قوۃ" ایک حضرت خفا ہوئے۔ "یہ حرامی اب تک سمجھتے ہیں کہ ہم انھیں کے ٹکڑوں پر پل رہے ہیں۔"

"ارے میاں قصور ان کا نہیں۔" دوسرے صاحب نے فیصلہ صادر کیا۔ "کیوں نہیں اس کم بخت عورت نے ایسی ذلیل خیرات کو نفرت سے ٹھکرا دیا؟"

"اللہ اللہ آزادی تو ملی' لیکن غلامی کا چسکا نہ گیا۔"

"جائے کیسے میرے بھائی' جائے کیسے؟ جب ایسے آقاؤں کی جوتیوں کے صدقے مفت کی گوشت روٹی ملے تو آزادی کی محنت کا بار کون اُٹھائے؟"

"اے طائرِ لاہوتی اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی!"

پہلے والے بزرگ نے رِقّت سے الاپا۔

دوسرے حضرت نے بھی آزادی اور خودی کی عظمت میں کچھ مصرعے ارشاد فرمائے۔ جب دلشاد چار آنے کے گوشت' تین آنے کی روٹی اور دو آنے کی چائے سے اپنے دوزخ شکم کو ایندھن دے چکی تو وہ دونوں بزرگ جنبش فرما کر اس کے پاس آئے۔

"اے عورت کیا تم مہاجر ہو۔" ایک نے خشمگیں انداز سے پوچھا' جیسے زمانہ سلف کا قاضی کسی زانیہ عورت سے خطاب کر رہا ہو۔

"جی نہیں' میرا نام دلشاد ہے۔"

"ارے ہو گا' لاحول ولاقوۃ' ہم پوچھتے ہیں تم کہاں سے آئی ہو۔ کہاں جاؤ گی اور یہاں پر تمہارا کیا کام ہے؟" دوسرے حضرت نے مہارنی کی۔

اے کاش دلشاد کو معلوم ہوتا کہ اس کی منزلِ مقصود کا نشان —— کس شاہراہ پر ملے گا۔ اس کے تخیّل میں تو مغرب کی ساری کائنات اس کی منزل تھی۔ وہ تو ایک ایسی وسیع برادری میں شامل ہونے

والی تھی، جس میں اسے سارے اپنے ہی اپنے نظر آتے ہوں۔ لیکن یہاں کی اینٹ، اینٹ اس سے پوچھتی تھی کہ تم کون ہو؟ تم کیا ہو؟ تمہاری جیب میں پیسے ہیں ——؟ تمہارے جسم میں تازگی ہے؟——

"تم مہاجر ہو۔" ایک بزرگ نے فتویٰ دیا۔ "تم مہاجر خانے چلی جاؤ۔"

"آزاد قوم کی بیٹیاں بھیک کے ٹکڑوں پر نہیں پلتیں، ہاں۔"

"تم کوئی بچّہ نہیں ہو۔ تمہیں خود شرم آنی چاہیے۔"

دلشاد دیر تک بیٹھی سوچتی رہی کہ شاید وہ بزرگ مہاجر نام کی لڑکی کی تلاش میں تھے۔ جو کوئی گناہ کبیرہ سرزد کر کے گھر سے بھاگ گئی تھی۔ لیکن شام تک بہت سے لوگوں نے اسے ہی پکارا اور سب نے اُسے مہاجر خانے میں چلے جانے کی تلقین کی۔

مہاجر خانہ —— مسافر خانہ کے وزن پر۔ ایک دفعہ جب دلشاد اپنے ابّا کے ساتھ شہر گئی تھی تو وہ دونوں حاجی موسیٰ کے مسافر خانے میں ٹھہرے تھے —— مسافر خانے میں چھوٹی چھوٹی کوٹھڑیاں تھیں ایک بھٹیارن اوپلوں کی آگ پر ماش کی دال پکار رہی تھی جب دلشاد اس کے پاس چٹائی پر کھانا کھانے بیٹھی، تو بی بھٹیارن نے بہت سا گھی پیاز کے ساتھ بگھار کر اس کی دال میں ڈالا اور گرم گرم روٹیوں پر تازہ مکھن رکھ کر کھانے کو دیا۔ رات کو جب ملّا علی بخش عشاء کی نماز پڑھنے لگا، تو بھٹیارن

دلشاد کی چارپائی کے ساتھ اپنی چارپائی لگا کے لیٹ گئی اور دیر تک اسے مزیدار کہانیاں سناتی رہی۔ کبھی سات بیٹوں والے راجہ کا قصہ' کبھی پریوں کی بادشاہ زادی کا افسانہ۔ کبھی اپنے بھٹیارے کی جیون کہانی۔ بھٹیارن کئی دفعہ روئی' کئی دفعہ ہنسی۔ اور آج تک جب دلشاد شہر کی بارونق سڑکوں کا تخیل باندھتی' تو اس کے پردۂ خیال پر حاجی موسیٰ کی سرائے کا عکس ابھر آتا اور اس بھٹیارن کی تصویر بھی جو کبھی روتی تھی' کبھی ہنستی تھی' اور کبھی دلشاد کو گرم گرم چپاتیوں پر مکھن کے پیڑے رکھ کر کھانے کو دیتی تھی۔

مہاجر خانہ ——— شاید مسافر خانہ کا بگڑا ہوا نام ہو' جیسے گاؤں والے ہسپتال کو ڈاک خانہ کہتے ہیں۔ شاید شہر والے مسافر خانہ کو مہاجر خانہ کہتے ہوں ——— لیکن اس کو اپنا نیا نام کچھ زیادہ پسند نہ آیا۔ مہاجر بھی کوئی نام سا نام ہے بھلا؟ دلشاد تو بڑا رسیلا نام تھا۔ اس نام کے ساتھ ملّا علی بخش کی یاد وابستہ تھی جس نے قرآن شریف سے فال نکال کر اسے یہ نام دیا تھا۔ اسی ایک نام میں رحیم خاں کا افسانہ محبت بھی منظوم تھا۔ وہ دلشاد کے ساتھ آباد' بیداد' صیاد کے قافیے باندھ کر بڑے رس بھرے دوہے گایا کرتا تھا۔

مہاجر خانہ ——— جب وہ مہاجر خانے پہنچی تو لاہور کے شانوں پر رات کے گیسو پھیل رہے تھے۔ مہاجر خانے کا افسر ایک چھولداری میں رجسٹر کھولے بیٹھا تھا۔ کچھ دیر کے بعد دلشاد کی باری آئی۔

"نام؟" افسر نے طوطے کی طرح رٹا ہوا سوال دُہرایا۔

"دلشاد"

"عمر؟"

"بیس سال۔"

"باپ کا نام؟"

"ملّا علی بخش"

"زندہ ہے یا مر گیا؟"

"مار ڈالا گیا۔"

"گاؤں؟"

"چکور"

"ضلع؟"

"انبالہ"

"شادی شدہ؟"

"جی نہیں"

مہاجر خانے کے افسر نے قلم روکا اور خشمگیں نگاہوں سے دلشاد کو گھورا۔ "یہ لڑکی کس کی ہے؟"

"جی یہ میری لڑکی ہے۔" دلشاد ہکلانے لگی۔ "میری شادی ہو گئی ہے جی، میں بھول گئی جی۔"

افسر کا قلم مشین کی طرح پھر دوات کی طرف گھوم گیا۔

"سوچ کے بولو' خاوند کا نام؟"

"رحیم خاں"

"زندہ ہے یا مر گیا؟"

"جی ـــــ پتہ نہیں۔ خدا کرے زندہ ہو۔ خدا کرے میری عمر بھی اسے لگ جائے جی ـــــ"

مہاجر خانے کا رقبہ کافی وسیع تھا۔ کوئی آٹھ سو فٹ لمبا' پانچ سُو فٹ چوڑا۔ ایک کھُلا میدان۔ جس کے چاروں طرف کانٹوں والی تار کا احاطہ باندھا ہوا تھا۔ چھت کے لیے آسمان کالاجوردی سائبان تھا روشنی کے لیے ماہتاب کی قندیل اور تاروں کے ٹمٹماتے ہوئے چراغ تھے۔ ایک کونے میں باورچی خانہ تھا۔ زمین میں کھودے ہوئے عمیق چولہوں پر دال اور گوشت کی بڑی بڑی دیگیں پک رہی تھیں۔ رات کے اندھیرے میں چولہوں کی آگ دیگوں کے گرداگرد یوں بھڑکتی تھی' جیسے چتاؤں کے شعلوں میں دیوتاؤں کے لاشے جل رہے ہوں۔ آگ کی روشنی میں مہاجر خانے کا وسیع میدان نکھر آیا تھا' جس طرح شفق شام میں نتھرے ہوئے ابر پاروں کی سُرخی کسی قبرستان پر غبار خون کی طرح چھا جائے۔ ساری فضا میں ایک غمناک سا ٹھہراؤ تھا۔ ایک ہلکا سا' ایک غیر محسوس سا ارتعاش جس میں لاکھوں سینوں کے کچلے ہوئے ارمان اور ٹوٹے دلوں کی معصوم دھڑکنیں کپکپا رہی تھیں' تھرتھرا رہی تھیں' اور ہر لمحہ یہ ڈر لگتا تھا کہ کسی وقت سکون و جمود کا یہ مصنوعی طلسم یکایک ٹوٹ جائے گا۔ اور ایک

زبردست طوفان' ایک بے پناہ زلزلہ' ایک ہولناک چنگھاڑ زمین و آسمان کے نظام کو درہم برہم کر کے رکھ دے گی۔

دلشاد اپنی بچّی کو سینے سے لگائے قدم پُھونک پُھونک کر چلتی تھی۔ جس طرح قبرستان میں بچا بچا کر پاؤں رکھا جاتا ہے کہ کہیں کسی مقدس مزار کو ٹھوکر نہ لگ جائے۔ کچھ مہاجروں نے بانسوں پر چادریں تان کر چھوٹی چھوٹی جھونپڑیاں بنا لی ہیں۔ کچھ مہاجر کچی قبروں کی طرح یوں ہی آسمان تلے بیٹھے ہوئے تھے —— آسمان تیری لحد پر شبنم افشانی کرے —— کسی کے پاس چادر تھی' کسی کے پاس کمبل' کسی کے پاس لحاف' دلشاد کے پاس نہ چادر تھی' نہ کمبل تھا' نہ لحاف۔ وہ خود ایک چیتھڑا تھی۔ ایک بوسیدہ سا' ایک فرسودہ سا ٹکڑا' جو اس کے لباس دوشیزگی کی یاد میں باقی رہ گیا تھا —— مہاجر خانے میں ایسے سینکڑوں چیتھڑے بکھرے پڑے تھے۔ سب کے دل میں اُمّید کی لو لگی ہوئی تھی کہ اب وہ اپنی پیاری سرزمین پر آ گئے ہیں۔ اب اس ارض مقدس کی خاک ان کے گلتے ہوئے ناسوروں پر مرہم بن کر لگ جائے گی۔ اب یہاں کا متبرک پانی ان کے رستے ہوئے زخموں کو دھو ڈالے گا۔ اب یہاں کے سُورج اور چاند کی تنویریں ان کے چاک دامنوں کو رفو کر دیں گی۔

ایک خالی سی جگہ دیکھ کر دلشاد ٹھہر گئی۔ کچھ دور آگے ایک کہنہ سال ضعیف آدمی ڈیرہ ڈالے بیٹھا تھا۔ اس کے ساتھ دو بچے تھے' ایک آٹھ دس سال کا لڑکا محمود' ایک گیارہ بارہ برس کی لڑکی زبیدہ' وہ تینوں ایک

مٹی کے پیالے پر جھکے ہوئے روٹی کھا رہے تھے۔ محمود پوچھتا تھا کہ دادا آج سالن میں بوٹی کیوں نہیں؟ زبیدہ اپنے دادا کی وکالت کرتی تھی اور کہتی تھی کہ ہر روز گوشت نہیں کھایا کرتے' اس سے پیٹ خراب ہو جاتا ہے' دانتوں کو کیڑا لگ جاتا ہے ـــــ لیکن محمود مچل رہا تھا۔ دادا اسے چمکارتا تھا۔ زبیدہ اسے ڈانٹتی تھی۔ "کیا میں تجھے اپنی بوٹیاں کاٹ کر دے دوں۔" وہ چھوٹی سی بہن اپنے چھوٹے سے بھائی کو بزرگوں کی طرح ڈانٹتی تھی اور دیکھنے والے کو یہ محسوس ہوتا تھا کہ اس مختصر سے خاندان کا نگہبان دادا نہیں' زبیدہ ہے۔ اس لڑکی کا شعور اس قدر حساس اور بیدار تھا کہ وہ بیک وقت ایک ننھّی سی بہن' ایک ننھی سی بیٹی' ایک ننھی سی ماں کے فرائض انجام دے رہی تھی۔

"یہیں بیٹھ جاؤ' بیٹی۔ تمہارے ساتھ کوئی اور ہے؟" بڈھے دادا نے دلشاد سے پوچھا۔

"جی نہیں ـــــ میرے ساتھ اور کوئی نہیں۔"

"جاؤ روٹی لے آؤ باورچی خانے سے۔ تمہارے پاس کوئی پیالہ ہے؟"

"جی نہیں۔ میرے پاس کوئی برتن نہیں۔"

دادا نے اپنا ایک خالی پیالہ اُسے دے دیا۔

"پالا بھی بہت ہے بیٹی۔ تمہارے پاس کوئی بستر ہے؟"

"جی نہیں' میرے پاس کوئی بستر بھی نہیں۔"

دادا نے اس ویران ہستی پر ہمدردی کی ایک بھرپور نگاہ ڈالی۔ وہ بھی بالکل اسی حالت میں یہاں آیا تھا۔

"باورچی خانے کے پاس کپڑوں کا دفتر ہے۔ کمبل مانگ لینا وہاں سے۔" پھر دادا نے ستاروں کو دیکھ کر وقت کا حساب لگایا۔ "نو بج رہے ہیں۔ شاید سٹور بابو جاگتا ہو۔"

باورچی نے دلشاد کو دو روٹیاں اور پیالہ بھر دال دے دی۔ کپڑوں کے دفتر میں ایک مدھم سی لالٹین جل رہی تھی۔ خیمے میں رضائیوں کے انبار لگے ہوئے تھے۔ سُرخ سُرخ، بھورے بھورے، کالے کالے کمبلوں کی تہوں پر تہیں جمی ہوئی تھیں۔ ایک کونے میں گرم کپڑوں کے ڈھیر تھے۔ اونی سوئٹر پٹو کے کوٹ، گرم چادریں —— سٹور بابو سُرخ و سفید چھینٹ کی رضائی اوڑھے چارپائی پر لیٹا ہوا اقبال کا شکوہ گا رہا تھا۔

رحمتیں ہیں تری اغیار کے کاشانوں پر
برق گرتی ہے تو بے چارے مُسلمانوں پر

جب اُس نے دلشاد کو خیمے کے دروازے میں کھڑا ہوا پایا تو اس کے ترنم کی لے سُست پڑ گئی اور اس نے نہایت خشمگیں انداز سے دلشاد کو گھورا۔

"دفتر بند ہے جی اس وقت۔ صبح آٹھ بجے آنا۔"

"ہمارے پاس کوئی کپڑا نہیں ہے۔ ہم پالے سے مر جائیں گے۔"

"کوئی نہیں مرتے۔ صبح آٹھ بجے آنا' ہاں۔ دفتر بند ہے اس

وقت۔"

دلشاد نے ایک بار پھر التجا کی۔ سٹور بابو جھنجھلا گیا۔

"مَیں کہتا ہوں چلی جاؤ سیدھی طرح، میں بھی آخر انسان ہوں۔ مشین نہیں ہوں، ہاں صبح آٹھ بجے آنا۔" اور پھر وہ اپنے نرم و گرم لحاف میں سکڑ کر شکوہ گانے لگا ——

آئے عشاق گئے وعدہ فردا لے کر
اب انہیں ڈھونڈ چراغِ رخِ زیبا لے کر

جوں جوں رات بھیگتی گئی، سردی میں اضافہ ہوتا گیا اور رفتہ رفتہ یُوں محسوس ہونے لگا جیسے ساری کائنات یخ بستہ ہو گئی ہو۔ سرد ہوا کے جھونکے تیرو نشتر کی طرح بدن میں لگتے تھے اور زمین کی نمی زہر آلود کانٹوں کی طرح جسم میں چبھتی تھی۔ دادا کے پاس ایک کمبل تھا۔ اس نے اسے آدھا نیچے بچھا کر محمود اور زبیدہ کو سلا دیا تھا اور آدھا کمبل ان کے اوپر ڈال دیا تھا۔ وہ خود ایک پتلی سی چادر اوڑھے زمین پر لیٹا ہوا کروٹیں بدل رہا تھا۔ دلشاد کے دانت کٹ کٹ بج رہے تھے۔ وہ اپنی بیٹی کو اُونی کپڑے میں لپیٹ کر اپنے سینے سے چمٹائے بیٹھی تھی۔ کبھی وہ لیٹ جاتی تھی۔ کبھی اُٹھ بیٹھتی تھی —— کبھی کھڑی ہو کر گھومنے لگتی تھی۔ لیکن ہر کروٹ، ہر پہلو سردی کا اثر سانپ کے زہر کی طرح اس کی ہڈیوں میں سرسراتا ہوا بڑھ رہا تھا اور اسے ڈر لگتا تھا کہ شاید اگلے لمحے وہ برف کے ٹکڑے کی طرح جم کر گر جائے گی۔

کچُھ دور آگے ایک جوان عورت اپنے جسم کی گرمی ہر ممکن طریقہ سے اپنی چار سالہ لڑکی کے جسم میں منتقل کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ان کے پاس بھی نہ کمبل تھا' نہ لحاف' نہ چادر لڑکی کا سانس اکھڑا اکھڑا سا تھا۔ اس کے سینے میں گھنٹیاں سی بج رہی تھیں۔ جیسے بہت دور' افقی لکیر سے پرے' اونٹوں کا ایک کارواں کسی جنت گم گشتہ کی تلاش میں چلا جا رہا ہو' چلا جا رہا ہو' رواں رواں' دواں دواں ------ جیسے جیسے سردی بڑھتی گئی' لڑکی کے سینے کی گھنٹیاں تیز تر ہوتی گئیں۔ اس کے سانس میں ایک زبردست تناؤ آگیا جیسے زندگی اور موت کے فرشتے اس کے سانس کی لڑی تھام کر آپس میں رسہ کشی کر رہے ہوں۔

اس کی ماں گھبرا گئی۔ بے بس ہو گئی' لاچار ہو گئی۔ اس نے کھڑے ہو کر گردوپیش کا جائزہ لیا۔ زمین پر اندھیرے کا سیاہ کفن چڑھا ہوا تھا۔ کبھی کبھی چاند بھی اپنے لحافوں کی اوٹ سے جھانک کر دیکھ لیتا تھا۔ چاروں طرف سکوت پا کر وہ عورت سمٹ کر بیٹھ گئی۔ اس نے چوروں کی طرح دزدیدہ نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھا اور ہولے ہولے جھجکتے ہوئے' شرماتے شرماتے اس نے اپنے کپڑے کھول کر اپنی ٹھٹھری ہوئی بیمار بچی کو ان میں لپیٹ لیا۔ اندھیرے میں ایک بجلی سی لہرائی اور اس جوان عورت کا برہنہ جسم کائنات کے ذرے ذرے کو للکارنے لگا کہ دیکھو دیکھو یہ لاجواب ساعت بیت نہ جائے۔ تم نے ارض و سما کے بہت سے راز دیکھے ہوں گے۔ لیکن تم اس ماں کے برہنہ جسم کو نہ بھول سکو گے جس کے کپڑوں

میں اس کی مرتی ہوئی بیٹی لیٹی پڑی ہو اور بڑا سخت پالا پڑ رہا ہو اور سٹور میں گرم کمبل اور لحافوں کے ڈھیر ہوں۔ اور سٹور بابو رضائی میں لپٹا ہوا "شکوہ" گا رہا ہو اور ـــــــ عورت کا عریاں جسم ایک غلیظ گالی بن کر چاروں طرف چھا گیا۔ رات کی ظلمت میں روسیاہی کی کالک اور بھی زیادہ گہری ہو گئی۔ آسمان پر جو ستارے ٹمٹما رہے تھے آنکھیں موند کر بادلوں کی اوٹ میں چھپ گئے۔ چاند بھی اپنے لحافوں کے بیچ سے جھانک کر یہ نظارہ دیکھنے کی تاب نہ لا سکا۔ ایک گھنگھور گھٹا جو آسمان پر بے پروائی سے بکھری ہوئی تھی، سمٹ سمٹ کر اکٹھی ہو گئی۔ اور بادلوں کی پلکوں سے موٹے موٹے آنسو گرنے لگے۔

ٹپ ٹپ ٹپ ـــــــ ٹپ ٹپ ٹپ ـــــــ بوندیں برس رہی تھیں۔ ٹھٹھری ہوئی ہوا کی سُن سُن سسکیوں کی طرح آہیں بھر رہی تھیں۔ مہاجر خانے کے میدان میں زندگی کی ایک کمزور سی لہر جاگی، کچھ بچے روئے، کچھ عورتوں نے شور مچایا، کچھ مردوں نے ڈانٹ بتائی اور پھر ایک سناٹا چھا گیا۔

مینہ کی بوندیں دلشاد کے بدن میں بندوق کے چھرّوں کی طرح پیوست ہو رہی تھیں۔ اسے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے امریک سنگھ، ترلوک سنگھ، سورمکھ سنگھ، دربار سنگھ کی کرپانیں اس کے جسم کو چھید رہی ہیں۔ بارش کا پانی فلالین کے گرم ٹکڑے میں بھی نفوذ کرتا گیا اور اس میں لپٹی ہوئی ننھی سی جان سردی سے کپکپانے لگی۔ دلشاد نے سوچا کہ اگر وہ دا،ا

سے پوچھ کر اپنی لڑکی کو محمود اور زبیدہ کے کمبل میں لٹا دے تو شاید اس غریب کی جان کو کچھ سہارا مل جائے۔ اس نے دادا کے گھٹنے کو ہلایا' وہ اپنی میلی سی چادر اوڑھے لیٹا ہوا تھا۔ دلشاد نے اسے شانوں سے ہلایا' بانہوں سے ہلایا۔ گردن سے جھنجھوڑا' ہاتھ کھینچے' لیکن دادا کا خاکی جسم سردی اور گرمی کے احساس سے بے نیاز ہو گیا تھا۔ زندگی کا خون اس کی رگوں میں جم کے رُک گیا تھا۔ اور اس کی ہڈیاں سردی سے اکڑ کر لوہے کی سلاخوں کی طرح تن گئی تھیں۔

جب صبح صادق کی پو پھٹی تو مہاجر خانے کے میدان میں ایک مرمریں مجسمہ چاندی کی طرح جھلملایا۔ یہ اس جوان عورت کا برہنہ جسم تھا۔ جس نے اپنے کپڑوں میں اپنی مرتی ہوئی بچی کو لپیٹ لیا تھا۔ اس کے بے جان سینے سے اس کی بچی کی لاش یوں چمٹی ہوئی تھی جیسے ابھی ابھی دودھ پینے لگی ہو۔ معلوم ہوتا تھا کہ کسی بڑے فن کار نے مَرمَر کو تراش کر یہ خوبصورت بُت بنائے ہیں۔ عورت کے کسے ہوئے دودھیا بدن پر بارش کے قطرے موتیوں کی طرح جگمگا رہے تھے۔ اس کی گھنی زلفیں کالے ناگوں کی طرح بکھری پڑی تھیں۔ اس کی نیم باز آنکھوں میں پانی کی ایک تہ سی جمی ہوئی تھی' جیسے اس کے خون کے ساتھ ساتھ اس کے آنسو بھی منجمد ہو کے رہ گئے ہوں۔

مہاجر خانے کے کچھ مہتر کمبلوں کا پلندا اٹھا کر لے آئے۔ ایک کمبل انہوں نے دادا پر ڈال دیا۔ دوسرا عورت کے ننگے بدن پر' تیسرا اس

بچی پر چوتھا ـــــ اور اسی طرح وہ میدان میں بکھری ہوئی لاشوں پر نرم نرم کمبلوں کے کفن ڈالتے گئے جو لوگ زندہ تھے وہ حسرت بھری نگاہوں سے اپنے مردہ ساتھیوں کی طرف دیکھتے تھے اور رشک کرتے تھے کہ اگر موت کے تصوّر میں ایک اَن دیکھی ان جانی ان سمجھی حقیقت کا خوف نہ ہوتا۔ تو وہ سب برضا و رغبت وہیں مرجاتے تاکہ مہاجر خانے کے مہتران پر بھی اُونی کمبل ڈالتے جائیں۔ اور ان کے کپکپاتے ہوئے گوشت اور ٹھٹھرتی ہوئی ہڈیوں کو ذرا سا سکون' ذرا سی گرمی' ذرا سا آرام میسّر آئے۔

محمود مچل رہا تھا کہ دادا کو وہ لوگ اٹھا کر کہاں لے گئے؟ زبیدہ اُسے سمجھاتی تھی کہ دادا' ابّا اور امّی کو بلانے گئے ہیں ـــــ وہ کب آئیں گے؟ ـــــ وہ بہت جلد آ جائیں گے' میرے محمود' وہ تو بس آتے ہی ہوں گے۔ ابّا اور امّی کہاں گئے ہیں؟ وہ تھوڑی دیر کے لیے اللہ میاں سے ملنے گئے ہیں۔ وہ اس کے دربار سے تمہارے لیے عمدہ عمدہ کھلونے لائیں گے۔ شیشے کا لٹو' ربڑ کی گیند' چابی والی موٹر' نئے بوٹ' تلے دار ٹوپی ـــــ محمود کا تخیّل طرح طرح کے سوال ایجاد کرتا تھا۔ زبیدہ طرح طرح کے جواب گھڑ کر اسے ٹالتی تھی اور جب کبھی محمود اِدھر اُدھر کھیل میں لگ جاتا تو وہ نظر بچا کر منہ چھپا کر اپنے دل کا غبار نکال لیتی تھی۔

مہاجر خانے کی مشین بائیسکوپ کی طرح چل رہی تھی۔ صبح سے شام تک اس کے پردے پر بھانت بھانت کے سین آتے تھے اور نکل جاتے تھے۔

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشہ مرے آگے

بڑے بڑے دبدبے والے رئیس اور نواب آتے تھے۔ اونچی اونچی کرسیوں والے حکّام آتے تھے۔ سرسراتے ہوئے ریشم و کمخواب میں ملبوس کلیوں کی طرح کھلے ہوئے حسن میں سرشار گلاب اور چنبیلی کے عطر میں مہکی ہوئی بیگمات آتی تھیں وہ سب بچّوں کے سر پر شفقت کا ہاتھ پھیرتے تھے۔ عورتوں کے پاس کھڑے ہو کر ان کی اشک شوئی کرتے تھے۔ بوڑھوں اور جوانوں کی پیٹھ ٹھونک کر ان کی ٹوٹی ہوئی کمر کو سہارا دیتے تھے اور پھر سبکسار موٹریں انہیں مہاجر خانے سے واپس لے جاتی تھیں۔ کوئی مٹھائی لاتا تھا' کوئی کپڑے بانٹتا تھا' کوئی پلاؤ اور قورمے کی دیگیں تقسیم کرتا تھا اور جب کوئی اس کارِ خیر میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا تو اس کے چہرے پر فخر و مسرّت کی سرخی پھیل جاتی اور وہ دل ہی دل میں اپنے رحمان اور رحیم کا شکریہ ادا کرتا کہ اس نے اپنی قدرت کاملہ سے ایسے سامان پیدا کر دیے جن کے طفیل اس ناچیز کو بھی مقدور بھر خیرات کرنے کا موقع نصیب ہوا ——— دلشاد سوچتی تھی کہ جب کوئی جوان مرد محمود اور زبیدہ کا قصّہ سنے گا تو سٹور بابو کو کان سے پکڑ کر گولی سے اڑا دے گا کہ اس نے اس کڑاکے کی سردی میں بھی دادا کو صرف ایک ہی کمبل دیا۔ وہ ڈرتی تھی کہ جب کوئی دبدبے والے' طنطنے والے بلند اقبال لوگ اس کی اپنی رام کہانی سنیں گے تو ان کا خون کھول اٹھے گا۔ ان کی غیرت کو شدید چوٹ

لگے گی۔ اور وہ اپنی بندوقیں اٹھا کر امریک سنگھ' ترلوک سنگھ' کرتار سنگھ' دربار سنگھ کی تلاش میں چل نکلیں گے ـــــ لیکن سننے والے سنتے گئے' سنانے والے سناتے گئے۔ دن میں مٹھائی اور پلاؤ بٹتا گیا رات کو زمستانی ہوا کی شمشیر اپنے وار کرتی گئی اور مہاجر خانہ کا بائیسکوپ بدستور چلتا گیا۔ ایک سین کے بعد دوسرا سین' دوسرے سین کے بعد تیسرا سین ـــــ نہ آغاز نہ انجام' ایک مسلسل اور پیچیدہ نظام ترحم کہ جس میں انسان' انسان کا رازق بننے کے لیے بے قرار ہو' بے چین ہو اور اس بازی میں دوسروں پر سبقت لے جانے کے لیے ہر قسم کا داؤ ہر قسم کا پیچ کھیلنے پر تُلا ہوا ہو۔

ایک صاحب بڑے مخیّر تھے۔ بدن پر خوشنما سوٹ' سر پر ترچھی ٹوپی آنکھوں پر سونے کے فریم والی سبز عینک' اگلے دانتوں میں سنہری کیلیں' منہ میں پائپ' انگلیوں میں لعل اور یاقوت کی بیش بہا انگوٹھیاں ـــــ وہ گھنٹوں مہاجر خانہ میں گھومتے تھے۔ ایک ایک کی داستان سنتے تھے۔ کسی کو پیسے دیتے تھے۔ کسی کو مٹھائی کی گولیاں۔ کسی کو چاکلیٹ ـــــ دلشاد پر بھی ان کی خاص نظرِ عنایت تھی۔ ایک روز وہ اس کی بچّی کے لیے سرخ اُون کا دیدہ زیب سوئٹر لائے۔ دوسرے روز انہوں نے رحیم خاں کی تلاش کرنے کا وعدہ فرمایا اور کچھ دنوں کے بعد وہ دلشاد کے لیے ایک جانفزا عید کا پیغام لے کر آئے کہ رحیم خاں کا پتہ مل گیا ہے۔ بچارا بے حد کمزور ہے۔ چلنے پھرنے سے معذور' لیکن دلشاد کی یاد کے سہارے وہ ابھی تک

بارِ زیست اٹھائے بیٹھا ہے۔ دلشاد کی نظر میں دنیا گلنار ہو گئی۔ مہاجر خانے کی زمین پر پُھول ہی پُھول اُگ آئے۔ اس کے بدن میں سلگنے والا زہر کافور کی طرح مشکبار ہو گیا اور وہ اپنے دھڑکتے ہوئے سینے میں ارمانوں کا بے پناہ ہجوم چھپائے مسٹر مصطفیٰ خاں سیمابی کی موٹر میں آ بیٹھی۔ کار فراٹے بھرتی جا رہی تھی۔ لاہور کی سڑکیں رنگین سانپوں کی طرح لہرا لہرا کر گزر رہی تھیں۔ یہ باغ جناح ہے' یہ گلستان فاطمہ کی چار دیواری ہے۔ یہ ملکہ معظمہ کا بت ہے۔ یہ مال روڈ کے رنگین ریسٹوران ہیں۔ یہ نیلا گنبد کا چوک ہے۔ اس گلی میں انارکلی کا مقبرہ ہے۔ یہ گرجا ہے' وہ مسجد ہے ——— یہ مصطفیٰ خاں سیمابی کا مکلّف بنگلہ ہے۔ نوکروں کے کمرے میں گراموفون بج رہا ہے۔

آج کر لے جی بھر کے سنگار' تو ہے جانا ہے
آج کر لے جی بھر کے سنگار'

دلشاد کا دل دھک دھک بج رہا تھا۔ اس دُھک دھک میں ایک انوکھے سُرور کا ترنّم تھا۔ وہ برآمدے میں بیٹھے بیٹھے سوچ رہی تھی کہ شاید اس زمین پر رحیم خاں کے قدم پڑے ہوں۔ شاید اس بنگلہ کی ہوا میں اس کی دلآویز سانس بسی ہوئی ہو ——— دلشاد کی نظرِ عقیدت میں بنگلے کی زمین کا ذرّہ ذرّہ مکہ اور مدینہ کی خاک بن گیا۔ بنگلہ کی اینٹ اینٹ پر مسجدوں کے مقدس منارے تعمیر ہو گئے ——— ایک نوکر نے اسے ایک پلیٹ میں پلاؤ' ایک میں پالک اور گوشت' ایک میں مٹر اور قیمہ' ایک میں کیوڑے

میں لگائی ہوئی فرنی لا کر دی۔ معلوم نہیں وہ کیا کھا گئی اور کب کھا گئی ——— وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر تھی۔ اس کی رُوح اپنے رحیم خاں کے استقبال کے لیے سراپا انتظار بنی ہوئی تھی لیکن اس کے جسم کو ابھی تک کتے چچوڑ رہے تھے ——— مصطفیٰ خاں سیمابی ڈریسنگ گاؤن پہنے اس کے سامنے بُھوکے گدھ کی طرح منڈلا رہا تھا۔ میز پر سکاچ وسکی کی بوتل جگمگا رہی تھی۔ وہ اپنی بانہیں پھیلا پھیلا کر کہتا تھا' کہ میری جان' آ کر میرے سینے سے لگ جاؤ۔ تم بڑی مظلوم ہو ——— تم بڑی غریب ہو لیکن میں ایک امیر انسان ہوں میں کچھ روز کے لیے تمہیں ملکہ بنا کے رکھوں گا۔ تمہارا رحیم خاں معلوم نہیں کہاں کھو گیا۔ شاید وہ کسی ویرانے میں مرا پڑا ہو۔ لیکن تم اس فرضی ہستی کی یاد میں اپنی جوانی نہ گنواؤ! میری جان' آؤ۔ میرے سینے سے لگ جاؤ۔ اب تم اپنے آزاد وطن میں آ گئی ہو ——— اب تمہیں کسی بات کا ڈر نہیں۔ یہ ہمارا وطن ہے ——— یہ ہمارا آزاد وطن ہے۔ پاکستان زندہ باد! پاکستان پائندہ باد!! ——— دلشاد کے گلے میں مُلّا علی بخش کی تسبیح لٹک رہی تھی۔ جب مصطفیٰ خاں سیمابی کی زبان لپک لپک کر تسبیح کے دانوں کو چومتی تو دلشاد کو یہ محسوس ہوتا کہ ایک مسلمان بھائی سنگ اسود کو بوسہ دے رہا ہے ———'

دو چار دن میں جب مصطفیٰ خاں سیمابی نے اپنے حج کے ارکان پورے کر لیے تو دلشاد پھر مہاجر خانے واپس آ گئی۔ ننّھا محمود شیشے کا لٹو چلا رہا تھا۔ اس نے تتلا تتلا کر' تالیاں بجا بجا کر دلشاد کو سمجھایا کہ زبیدہ باجی

بھی موٹر میں بیٹھ کر دادا میاں کے پاس گئی تھی ——— دادا میاں نے شیشے کا یہ لٹو بھیجا ہے۔ یہ ربڑ کی گیند' یہ رنگ دار مٹھائی' آج وہ پھر موٹر میں بیٹھ کر دادا میاں کے پاس گئی ہے۔ موٹر پُوں پُوں کرتی جا رہی ہے۔ اب وہ پھر دادا میاں سے پیسے لائے گی۔ نئے نئے بوٹ لائے گی ——— تلّے دار ٹوپی لائے گی ——— !

لاہور' لاہور نہ تھا' مدینہ تھا۔ لاہور والے' لاہور والے نہ تھے۔ انصار تھے ——— نہیں! وہ تو شاید انصار مدینہ سے بھی کچھ درجہ افضل تر تھے۔ یہاں دلشاد کے لیے ہر روز ایک نیا رحیم خاں پیدا ہو جاتا تھا ——— زبیدہ کے لیے ہر روز ایک نیا دادا جنم لیتا تھا۔ بیٹیوں کے لیے' نئے نئے باپ تھے ——— بہنوں کے لیے نئے نئے بھائی ——— جسم کا رشتہ جسم سے ملتا تھا' خون کا رشتہ خون سے ———'

رَبُّ الْعَالَمِیْن

مجھے فکرِ جہاں کیوں ہو جہاں تیرا ہے یا میرا

کراچی

دِلشاد نے کھڑکی سے منہ نکال کر دیکھا۔ صدر کے اسٹیشن پر گہما گہمی تھی۔ ریفیوجی سپیشل کی مخلوق گاڑی سے نکل نکل کر پلیٹ فارم پر جمع ہو رہی تھی۔ سارا اسٹیشن کھچا کھچ بھرا ہُوا تھا۔ لیکن دیکھتے ہی دیکھتے بھیڑ بادلوں کی طرح چھٹ گئی۔ پلیٹ فارم پر کچھ قلی، کچھ باہر جانے والے مسافر، اور کچھ ٹکٹ چیکر باقی رہ گئے۔ آن کی آن میں ریفیوجیوں کا جمِّ غفیر بے مایہ قطروں کی طرح کراچی کے محیط بے کراں میں غرق ہو گیا، جیسے سمندر کی تیز و تند لہر ساحل کے خس و خاشاک کو اپنے تموج میں بہا لے جائے یا جیسے سورج کی کرنیں شبنم کے موتیوں کو اپنے دامن میں چھپا لیں یا جیسے شراب کا نشہ دل کے گوشے میں لرزندہ اندیشوں کو اپنے خمار کی آغوش میں سلا دے یا جیسے کسی گلتی ہوئی، سڑتی ہوئی لاش کا تعفن گلاب اور موتیے کی شمیم کو اپنے سینے کے اندر جذب کر لے،

منوڑا آئی لینڈ تیز تیز قمقموں کی روشنی میں جگمگ کر رہا ہے ـــــ کلفٹن بیچ چودھویں رات کی چاندنی میں نہایا ہوا ہے۔ سمندر کی

لہریں ساحل کو چھیڑ چھیڑ کر ایک مدہوش سا رباب بجا رہی ہیں۔ لہروں کا پانی ریتلے ٹیلوں سے ٹکرا کر فضا میں نقرئی فواروں کی طرح جھلملا رہا ہے۔ ہوا میں ایک نازک سی خنکی ایک نرم سی ملائمت ہے۔ زندگی کی ایک میٹھی سی تڑپ پیچ پر مخمور سانپوں کی طرح لہرا رہی ہے۔

چار جوان وسکی کے جام بھر کر سوڈا ملا رہے ہیں۔ "ہائے ہائے دِلّی۔" ایک نے سینے پر ہاتھ مار کے آہ بھری۔

"سواد رومتہ الکبریٰ میں دلی یاد آتی ہے۔ ہائے ری دلی" دوسرے نے واویلا کیا۔

"کون جائے ذوق یہ دِلّی کی گلیاں چھوڑکر
ہائے دِلّی، تیری خاک پاک کی کشش

تیسرا رانوں پر تھپڑ مار مار کے ماتم کرنے لگا۔

چوتھا جوان سنجیدہ رہا۔ وہ وسکی کا جام ہونٹوں سے چپکائے مراقبے میں گیا ہوا تھا۔ جب اس کے ساتھیوں نے ذرا زور شور سے دِلّی کی نوحہ خوانی شروع کی، تو وہ چونکا —— "ایں؟ یہ تو وہی سالی کراچی رہی۔ واللہ خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا، کیا دیکھتا ہوں کہ چاوڑی بازار میں چہل پہل ہے۔ بی چاند جان کا بالا خانہ ہے اور وہ ساقی مہوش اپنی حنائی انگلیوں میں ساغر اٹھائے آ رہا ہے، لا رہا ہے، آ رہا ہے، لا رہا ہے ——"

ہائے ہائے دِلّی! ہائے ہائے دِلّی! ہائے بی چاند جان، وائے بی چاند

جان —— وہ چاروں ایک فصیح و بلیغ مرثیے کی دُھن میں کھو گئے اور ٹھنڈی ریت پر لوٹ لوٹ کر اپنی جنت گم کردہ کا ماتم کرنے لگے۔

کچھ دور پرے ایک مقطع و متشرع بزرگ پان چبا رہے تھے۔

ان کے آگے چند عقیدت مند دو زانو بیٹھے تھے۔

"دِلّی گئی، دِلّی والے گئے، سب کچھ گیا لیکن کچھ نہ گیا۔"

"پان لاؤ" بزرگ نے فرمایا۔

ان کی خدمت میں پان پیش کیا گیا۔

"تمباکو تو اچھا ہے بھئی" —— بزرگ نے رائے دی۔ "کہاں سے لائے؟"

کسی نے عرض کیا، ۲۹ روپے سیر ہے، لکھنؤ سے منگوایا تھا۔

"ہاں، تو میں کہہ رہا تھا کہ دلی گئی۔" بزرگ نے اپنی ٹوٹی ہوئی تان کو از سرِنو پکڑا۔ "دِلّی والے گئے، کیوں؟ جانتے ہو بھلا کیوں؟"

عقیدت مند سوچنے لگے کہ کیوں؟ ان کے چہروں پر کیوں کی سوالیہ علامت ٹھپہ بن کر لگ گئی۔

بزرگ نے خود ہی جواب دیا۔ "وہ لال قلعہ۔ وہ جامع مسجد، وہ قطب مینار، وہ قبریں جن میں بزرگوں کی خاک دو بول دُعا سننے کے لیے ترس رہی ہے۔ غالب کا مزار، شیخ المشائخ حضرت نظام الدین اولیاء کا مرقدِ نور —— سب چلے گئے۔ سب ہاتھوں سے نکل گئے۔ تم کہو گے اپنے نصیب، میں کہتا ہوں، اپنے اعمال، ہمارے اپنے ناگفتہ بہ اعمال، میں تم

کو بتاتا ہوں تقدیرِ اُمم کیا ہے؟ ——— پان لاؤ"

پان حاضر کیا گیا۔

"مَیں تم کو بتاتا ہوں تقدیرِ اُمم کیا ہے

شمشیر و سناں اول طاؤس و رباب آخر"

"دھت تیرے کی۔" وسکی والی پارٹی کا ایک جوان اپنے ساتھی پر گرج رہا تھا۔ "چاند جان میری تھی' وہ مجھ پر عاشق تھی۔ وہ تیرے منہ پر تھوکتی بھی نہ تھی ——— ہاں ———"

دوسرا جوان سوڈے کی بوتلیں اور خالی گلاس جمع کر کے ایک عملی سا جواب دینے کی تیاری کر رہا تھا۔

ان کے باقی دو ساتھی ایک دوسرے کے سر پر اُلٹا کھڑے ہونے کی مشق فرما رہے تھے۔ ایک پارسن لڑکی ان کی حرکات پر قہقہے لگا کر فضا میں ایک لذیذ سا ترنم' ایک پیارا سا ارتعاش پیدا کر رہی تھی۔ اس نے نہانے کا رنگین لباس پہنا ہوا تھا۔ اس بیدنگ کاسٹیوم میں اس کا چھریرا بدن قوس کی طرح تنا ہوا تھا ——— بزرگ فرما رہے تھے ——— پان لاؤ۔

چیف کورٹ اور اسمبلی ہال کے درمیان مہاتما گاندھی کا بت پہرے پر چوکس کھڑا ہے کہ کہیں انصاف اور سیاست ایک دوسرے کے قریب نہ آنے پائیں۔ دو سائیکل سوار ٹھہر کر اس کا جائزہ لینے لگے۔ ایک نے اس کی لاٹھی چھیننے کی کوشش کی' دوسرے نے اس کی عینک کو اڑانا چاہا۔ جب

وہ دونوں اس کوشش میں ناکام ہوئے تو ایک نے اپنی رومی ٹوپی اتار کر بت کے سر پر رکھ دی اور وہ خوش خوش وہاں سے چل دیے کہ انہوں نے چپکے چپکے اس بت کو مسلمان کر لیا۔

ایک ہندو خاندان ہجرت کر رہا تھا۔ ان کی خوشنما کوٹھی کے سامنے چار اونٹ گاڑیاں سامان سے لدی کھڑی ہیں۔ لوہے کے ٹرنک، چمڑے کے سوٹ کیس، لکڑی کی پیٹیاں ——— سامان میں ایک طوطے کا پنجرہ بھی ہے۔ طوطا مٹر کی پھلیاں کھا رہا ہے۔ جب کوئی اس کے پاس سے گزرتا ہے، تو وہ نیم باز آنکھوں سے اس کی طرف یوں دیکھتا ہے گویا کہہ رہا ہو کہ لو سالو! میں بھی چلا ——— اب میں دیکھوں گا تم اپنا پاکستان کیسے بناتے ہو ———؟

قصریہ ہوٹل کی رقص گاہ میں آرکسٹرا بج رہا ہے۔ ہوٹل کے مینیجر نے سٹیج پر آ کے اعلان کیا کہ آج رات کی نصف آمدنی قائداعظم ریلیف فنڈ میں دی جائے گی، لوگوں نے گرمجوشی سے تالیاں بجائیں۔

"میرا جی کراچی سے اُکتا گیا ہے۔" ایک دیدہ زیب بیگم نے شیری کا گلاس لبِ لعلیں سے لگا کر کہا۔ "چلو ڈیئر کچھ روز کے لیے بمبئی گھوم آئیں۔"

اس کا ساتھی شمپین پی رہا تھا۔ "اب تو بمبئی بھی مرحوم ہو گئی بیگم
—— سالی کانگرس اس پیرس صغریٰ کو راہب خانہ بنانے پر تلی ہوئی
ہے، نہ وسکی، نہ شیری، نہ جن نہ شمپین —— اب سنتا ہوں کہ ریس پر
بھی بندش لگانے کی سازش ہو رہی ہے۔"

"ارے ہاں"! بیگم کو ایکا ایکی یاد آیا۔ "ابھی اگلے روز پروفیسر
گھنشام کا خط آیا تھا۔ پر ہیبشن کے ہاتھوں بے چارہ مجبور ہو گیا ہے۔ ایک
کیس وسکی منگوائی ہے، 'کسی طرح بھجوا دو' ڈیئر۔"

ایک غیر ملکی سفیر کا سیکرٹری دوسرے غیر ملکی سفیر کے سیکرٹری سے
سرگوشی کر رہا تھا۔ "مجھے کراچی میں دو چیزیں بہت پسند ہیں۔"

"مجھے تین۔" دوسرے نے کہا۔

"پارسی لڑکیاں، اور مسلمان عورتوں کے برقعے۔"

"مجھے برقعے والیاں بھی پسند ہیں!"

"واللہ بڑے کو رذاق ہو۔ ان مدقوق عورتوں کو کون چاہے گا بھلا؟"

"انہیں میں چاہتا ہوں۔ یسوع مسیح کی قسم، مجھے یہ بیمار حسن پسند
ہے۔ پیلے پیلے گالوں میں نیلی نیلی رگوں کی لکیریں، اس پر غازے کا غبار
—— خزاں کے موسم میں گلاب کی پتیاں —— ہائے میں نے ایسا
حسین امتزاج کہیں نہیں دیکھا —— بوائے دو سوڈا دو وسکی۔"

"ایک ہی بات ہے تم پلاؤ یا میں پلاؤں —— ہمارے دونوں

ملکوں کا بلند نصب العین مشترک ہے۔ ہم اس اشتراک کو مستقل بنانے کی ہر ممکن کوشش کریں گے ـــــــ تمہاری صحت کے لیے۔"

ایک مسلمان ایڈیٹر لیمن سکوائش سے جی بلا رہا تھا۔ موقع پا کر وہ شراب اور کپڑے کے ایک بڑے تاجر کو گھیر کر کھڑا ہو گیا۔

"میں نے سنا ہے کہ پاکستان بننے کے بعد کراچی اور لاہور میں ولایتی شراب کی کھپت پہلے سے تگنی ہو گئی ہے؟" ایڈیٹر نے اپنے ایڈیٹوریل کے لیے مواد اکٹھا کرنا شروع کیا۔

"غلط" تاجر نے گرم جوشی سے تردید کی۔ "بالکل غلط' آپ بھی کیا عجیب افواہیں لے اڑتے ہیں۔ تگنی تو کیا اگر دُگنی بھی ہو جائے تو غنیمت ہے۔"

"افسوس" ایڈیٹر نے اصرار کیا۔ "کیا یہ امراس نئی اسلامی حکومت کے لیے شرمناک نہیں؟"

"پاکستان دُنیا کا پانچواں بڑا اور مُسلم ممالک میں سب سے بڑا ملک ہے۔" تاجر نے ایڈیٹر صاحب کی معلومات میں اضافہ کرنے کی کوشش کی'

"کیا یہ امراس سب سے بڑے مُسلم ملک کے لیے شرمناک نہیں؟" ایڈیٹر صاحب برابر مصر تھے۔

"قبلہ" تاجر نے وسکی کا لمبا سا گھونٹ بھر کر کہا۔ "آپ ریاست بنا رہے ہیں۔ مسجد نہیں ـــــــ"

"وہ کالے کالے برقعے۔" دوسرے غیر ملکی سفیر کا سیکرٹری پہلے غیر

ملکی سفیر کے سیکرٹری سے کہہ رہا تھا۔ ''سرخ و سبز ریشم کے سرسراتے ہوئے نقاب' برقعوں کی اوٹ میں جھانکتے ہوئے گول گول' پیلے پیلے' لال لال چہرے' سڈول بانہیں۔ ریشم کی تہوں سے جھلکتے ہوئے مخروطی ہاتھ —— کنواری مریم کی عصمت کی قسم' میں نے ایسے پر تپارے کہیں نہیں دیکھے۔ جب میں انہیں الفنسٹن سٹریٹ کی دکانوں میں بجلیاں گراتے دیکھتا ہوں' تو میرا جی بے اختیار چاہتا ہے کہ میں ان کے قدموں میں گر جاؤں اور ان کے نازک اور سبک پاؤں مجھے اپنی ٹھوکروں سے روندتے چلے جائیں' روندتے چلے جائیں'' ——

''بوائے دو پیگ وسکی اور سوڈا۔'' پہلے نے آواز دی۔

''اس بار میری طرف سے۔ بوائے! دو سوڈا' دو وسکی۔'' دوسرے نے کہا۔

''ایک ہی بات ہے' تم پلاؤ' یا میں پلاؤں —— ہمارے بہادر ملکوں کا نصب العین ایک ہی ہے۔ ہم پاکستان کے خانہ بدوش مہاجرین کی یکساں مدد کریں گے۔''

''یہ دونّی کھوٹی ہے' جی۔'' بس کے کنڈکٹر نے کرختگی سے کہا —— ''اسے بدل دو۔''

''یہ دونّی میں نے نہیں بنائی۔'' پنجابی پسنجر نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ ''میں یہ دونّی کوئی دِلّی یا لکھنؤ سے نہیں لایا۔ میں تمہیں ہرگز دوسری

دونّی نہ دوں گا۔"

کنڈکٹر نے بس روک دی۔" جب تک تم مجھے دوسری دونی نہ دو گے یہ بس آگے نہیں جائے گی۔"

کچھ پنجابیوں نے کنڈکٹر کو چند فصیح و بلیغ گالیاں دیں۔ "سالے سندھی' مفت پاکستان مل گیا سالوں کو' ہم بھی دو دن میں مزاج ٹھکانے لگا دیں گے' ہاں۔"

کنڈکٹر اور ڈرائیور باہر نکل کر ایک طرف کھڑے ہو گئے۔ "سالے پنجابی' پٹ پٹا کر یہاں آئے تو سالوں کا دماغ ہی نہیں ملتا۔ سر پر ہی چڑھے آتے ہیں' سؤر کے بچے' جیسے ان کی ماں کے خصم کا گھر ہے یہاں۔"

ایک ہندو راہ گیر یہ قصیدہ سن کر ٹھہر گیا اور داد کے طور پر اس نے کنڈکٹر اور ڈرائیور کو ایک ایک بیڑی پیش کی۔

دو بنگالی یہ ہنگامہ دیکھ کر بس سے نیچے اتر آئے۔

"لارنس روڈ کتنی دور ہے جی؟" ایک نے پوچھا۔

"یہی کوئی دو فرلانگ اور ہو گی۔" دوسرے نے اندازہ لگایا۔

"آؤ ٹہلتے ہی چلیں۔"

جب وہ دونوں بس سے ایک محفوظ فاصلے پر پہنچ گئے تو انہوں نے دونّی والے حادثے پر جی کھول کر تبصرہ کیا۔ "لڑنے دو' سالے سندھیوں اور پنجابیوں کو' کہتے ہیں پاکستان کی زبان اردو ہو گی۔' چھی' گویا شرنو بنگلہ بھاشا ہماری قومی زبان ہی نہیں ---- چھی ----"

صدر کے چوک میں ایک ایرانی ہوٹل والا' ایک چھابڑی والے پر گرج رہا تھا۔ "تم یہ گندے کیلے یہاں نہیں رکھ سکتے۔ میرے ہوٹل میں مکھیاں آتی ہیں ——— ہیں۔"

"ابے چل' ہوٹل کے بچے۔" چھابڑی والا اکڑ رہا تھا۔ "یہ پٹڑی تیرے باوا کی ہے؟"

ایرانی نژاد ہوٹل والے نے پاؤں کی ایک بھرپور ٹھوکر سے کیلوں کی چھابڑی اُلٹ دی۔ چھابڑی والا لپک کر اس کی ٹانگوں سے چمٹ گیا۔

ایک کانسٹیبل نے آکر چھابڑی والے کے منہ پر زور کا تھپڑ مارا۔ "سالے حرامی کتنی بار کہا ہے' یہاں بکری مت کرو لیکن سنتے ہی نہیں حرام زادے چلو' تھانے چلو۔"

چھابڑی والے نے گڑگڑا کر خوشامد کی' کہ داروغہ جی' میں اجمیر شریف سے آیا ہوں۔ میرا گھر بار سب لٹ گیا ہے۔ میری اندھی بہن میرے ساتھ ہے۔ مجھے چھوڑ دو۔ میں پھر یہاں چھابڑی نہیں لگاؤں گا۔

لیکن قانون' قانون ہے۔ قانون کی نظر میں نہ اجمیری کا امتیاز ہے نہ لاہوری کا۔ نہ اندھی بہن کی تمیز ہے۔ نہ آنکھوں والی کی۔ کانسٹیبل نے اپنا فرض منصبی بڑے احسن طور پر انجام دیا اور چھابڑی والے کو آگے لگا کر تھانے لے گیا ——— جب تھانیدار نے اندھی بہن کی تفصیل سنی تو اسے کانسٹیبل کی نالائقی پر بڑا غصہ آیا کہ کیوں نہ وہ اس کی اندھی بہن کو

بھی ساتھ ہی لیتا آیا ——

"دو اور دو چار —— چار اور تین سات —— سات اور نو کے
ہوئے؟" چیلا رام دلال نے خوشی محمد دلال سے پوچھا۔
خوشی محمد دلال چائے سے مکھّی نکال کر چمچہ چھٹک رہا تھا۔ ادھ موئی
مکھّی کو فرش پر گرا کے اس نے چائے کا ایک لمبا سا گھونٹ بھرا۔
"سات اور نو سولہ" چیلا رام نے خود ہی حساب لگایا۔ "میں نے کہا
"استاد' سیزن بُرا نہیں رہا۔"
خوشی محمد دلال نے اپنا لٹکا ہوا نچلا ہونٹ سمیٹ کر چائے کا ایک
اور لمبا سا گھونٹ لیا۔
"سچ پوچھو دوست تو بڑا کرارہ سیزن لگا تھا۔" چیلا رام کے گالوں کی
کچوریاں خوشی سے پھُول رہی تھیں۔ "ایک سیزن میں سولہ چھوکریاں!
رام قسم مَیں نے تو ایسا دھندا ساری عمر نہیں کیا تھا۔"
اطمینان قلب کے اظہار کے طور پر چیلا رام نے چاند تارے والی
جناح کیپ اتار کر اپنی گنجی چندیا کو زور زور سے سہلایا۔
خوشی محمد کا لٹکا ہوا نچلا ہونٹ اور بھی لٹک گیا۔ اور ردِ عمل کے طور
پر اس نے چائے کا ایک طویل سا گھونٹ سڑاپ لیا۔
"تم سالے قسمت کے دھنی ہو۔" خوشی محمد منمنایا۔ "چھوکری پر
چھوکری اتارتے تھے۔ یہاں مشکل سے صرف تین ہاتھ آئیں۔"

"تین چھوکریاں! تھو!! چیلا رام نے طنزاً ریسٹوران کے فرش پر بلغم کا ایک بڑا سا غلفہ تھوک دیا۔ "کالی کالی پوربنیں۔ کوئی آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتا تھا تھُو —— میرے پاس بڑے انمول دانے تھے' یار —— گرم گرم' سخت سخت پنجابنیں۔ نازک لچک دار دِلّی والیاں اور پھر وہ پٹیالے والی جنتی' ہائے ہائے ہیرا تھی' خوشی محمد ہیرا!"

چیلا رام نے ایک کھارا بسکٹ انگلیوں کے درمیان دبا کر توڑ ڈالا۔

"وہ سالا براؤن اسے پورٹ سعید لے گیا۔ کہتا تھا' بڑا کام دے گی وہاں —— میں نے کہا خوشی محمد' یہ پورٹ سعید کس طرف ہے؟"

"ہو گی کہیں۔" خوشی محمد کا بیوپار ذرا مندا تھا "چائے منگواؤ اب تو کوئی سالی ریفیوجی ٹرین بھی نہیں آتی۔"

گرم چائے کے دوسرے کپ پر وہ دونوں پھر اپنے اپنے خیالوں کی دنیا میں کھو گئے۔ چیلا رام دلاّل اپنے انمول دانوں کا حساب لگا رہا تھا۔ جو اس کے اپنے ہاتھوں سے نکل کر روئے زمین کے مختلف حصّوں میں بکھرے ہوئے تھے۔ قاہرہ —— لندن —— پورٹ سعید —— نہ جانے اس کے بیش قیمت تحفے کس کس شبستان کی زینت بنے ہوئے تھے کسی دمکدار آرام گاہ میں اس پٹیالے والی جنتی کا جسم بھی ریشمی اور کمخواب کے گاؤ تکیے کی طرح سجا ہوا ہو گا —— چیلا رام کے دل میں عجیب عجیب قسم کی آرزوئیں سر اُٹھا رہی تھیں۔ ایک بار اس کا جی چاہا' کہ وہ پر لگا کر پورٹ سعید جا پہنچے اور پانچ سو ستر روپے کے نوٹ سالے براؤن

کے منہ پر مار کے پٹیالے کی جنتی کو واپس لے لے اور اس کے گٹھے ہوئے مخملیں گاؤ تکیے ایسے جسم کو بانہوں پر اٹھا کر بھاگ آئے۔ طوفانوں سے لڑتا ہوا، سمندر کی لہروں سے ٹکراتا ہوا، پہاڑوں کی چھاتی کو چیرتا ہوا ــــــ

خوشی محمد دلال کی دنیا میں غم اور غصّے کا دھواں چھایا ہوا تھا۔ پہلے تو یہ سالے ریفیوجی ہوائی جہازوں میں بھر کر لائے جاتے تھے۔ ٹرینوں پر ٹرینیں لدی آتی تھیں ــــ لیکن اب کچھ دنوں سے بازار سرد تھا۔ وہ روز اخباروں میں نئی نئی خبریں پڑھتا تھا ــــ دلی میں خون ــــ کانپور میں خون ــــ کلکتے میں خون ــــ احمد آباد میں خون ــــ اجمیر میں خون ــــ لیکن اس سالے خون کے ریلے میں ایک ریفیوجی ٹرین بھی کراچی نہ پہنچتی تھی۔ خوشی محمد دلال کو اس بات کا سخت قلق تھا۔ پھر بھی اس نے کسی موہوم سی اُمید کا سہارا لے کر چھ پیسے کا خون کیا اور اخبار کی جلی سرخیوں پر للچائی ہوئی نظر دوڑائی۔ اخبار بیچنے والا چھوکرا گلا پھاڑ پھاڑ کر چیخ رہا تھا۔ "اب تو کشمیر میں بھی چھڑ گئی ــــ جموں میں لاکھوں مسلمانوں کا خون ہو گیا ــــ اب تو ــــ"

خوشی محمد دلال نے ہمہ تن شوق ہو کر خبریں پڑھیں۔ کشمیر کی جنّت میں بھی دوزخ کے شعلے بھڑک اُٹھے تھے۔ زعفران کے کھیتوں پر آگ برس رہی تھی۔ پھولوں کے دامن میں شرر جل رہے تھے۔ نسیم بہار کی جگہ ڈوگروں کی تلوار چل رہی تھی۔ ہزاروں مر گئے تھے، ہزاروں مر رہے تھے ہزاروں مینڈکوں کی طرح چھپ چھپ کر، چوہوں کی طرح رینگ

رینگ کر اس آتش کدۂ جہنّم سے باہر نکلنے کی کوشش کر رہے تھے۔

خوشی محمد نے چیلا رام کی ران پر زور سے ہاتھ مارا۔ ”اب تو کشمیر میں بھی لگ گئی، میرے یار۔ میں نے کہا، چیلا رام، ذرا سُن لو۔“

چیلا رام پورٹ سعید کے تصوّر میں مگن تھا۔ ”پھر تو سیب مہنگے ہو جائیں گے؟“ اس نے بے توجہی سے پوچھا۔

لیکن خوشی محمد میں شاعری کی روح حلول کر آئی تھی۔ اس نے چٹخارے لے لے کر کشمیر کی نازک بدن، سیم تن عورتوں کا ذکر سنایا۔ خوبصورت رنگین، گلفدار عورتیں ——— جن کے گالوں میں سیب ہوتے ہیں۔ چھاتی پر ناشپاتیاں۔ ہونٹوں پر انگور کا رس آنکھوں میں ڈل کی لہروں پر رقصیدہ کنول۔ گلے میں پہاڑی جھرنوں کا سرود۔ انگ انگ میں گلاب اور موتیے کی رنگت۔ زعفران کی بھینی بھینی مہک ———،

چیلا رام دلال کے منہ سے رال ٹپکنے لگی۔ وہ آنکھیں مل کر اٹھ بیٹھا اور خوشی محمد کے لیے اس نے چائے کا تیسرا کپ بھی منگوایا۔ پھر وہ سر سے سر جوڑ کر بیٹھ گئے اور کشمیر کے سیزن کی امید افزا عنایتوں میں کھو گئے ———،

ہوا کے تھپیڑوں سے بادباں لہرایا۔ موجوں میں ایک ہلکا سا تلاطم اٹھا ——— کشتی ڈگمگائی اور وہ سہم کر سیٹھ قائم علی دائم علی کے پہلو سے لگ گئی۔

سیٹھ قائم علی دائم علی کی توند میں ہنسی کا جوار بھاٹا سا اُٹھا اور پان کی پیک جو کچھ عرصہ سے اس کے منہ میں جمع ہو رہی تھی' بے اختیار بدر رو کے گندے پانی کی طرح بہ نکلی۔

بوڑھا ملاّح بیڑی سلگا کر مسکرایا۔ "کشمیر سے آئی ہے سیٹھ' اندھی ہے' بولو' کس طرف چلوں؟ پیرس یا وینس؟"

سیٹھ قائم علی دائم علی کا ایک دفتر پیرس میں بھی تھا۔ یوں بھی اس نے پیرس کے متعلق بڑی دلآویز باتیں سن رکھی تھیں لیکن اس وقت وہ اس چھوٹی سی ڈگمگاتی ہوئی کشتی میں اتنے لمبے سفر پر جانے کے لیے ہرگز تیار نہیں تھا۔ چنانچہ جب ملاح نے اسے پیرس یا وینس چلنے کی دعوت دی تو وہ بوکھلا گیا۔

چالاک ملاّح اس کی بوکھلاہٹ پر مسکرایا۔ "گھبراؤ نہیں سیٹھ' دور نہیں لے جاؤں گا' ہا! کیا جگہ ہے پیرس بھی! دیکھو گے تو مر جاؤ گے' ہا۔"

کیماڑی کی بندرگاہ میں خاصی چہل پہل تھی۔ اتوار کی چھٹی منانے والے ہجوم اِدھر اُدھر گھوم رہے تھے۔ کوئی منوڑا جا رہا تھا' کوئی سینڈپٹ آئی لینڈ ——— اور ایک جہاز بمبئی جانے کے لئے لنگر اٹھا رہا تھا۔ جہاز کے ڈیک پر سینکڑوں رنگین ساڑھیاں پھڑپھڑا رہی تھیں۔ لوگ دوربینیں آنکھوں سے لگائے کراچی کی آخری جھلک دیکھ رہے تھے۔ جب جہاز روانہ ہوا' تو کچھ لوگوں نے اپنے سروں سے جناح ٹوپیاں اتار کر سمندر میں پھینک دیں اور ہوا میں گھونسے لہرا لہرا کر "جے ہند" کا نعرہ لگایا۔

کشمیر کی اندھی دوشیزہ سیٹھ قائم علی دائم علی کے پہلو سے لگی ایک گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ جب لہروں کے تلاطم پر کشتی کا سینہ ڈگمگاتا تو اسے اپنا ہلکا پھلکا شکارا یاد آتا' جو اسی طرح ڈل اور وولر کی نازک لہروں پر تھرتھرایا کرتا تھا۔ پہلے دن جب اس نے سمندر کا چلو بھر پانی پیا تو اُسے قے آگئی ـــــ اُف! کتنا کڑوا پانی تھا۔ ڈل کا پانی تو تازہ دودھ کی طرح میٹھا تھا اور چشمہ شاہی کا پانی ـــــ ہائے جیسے دودھ اور مکھن اور شہد کو برف میں لگا کر پیا جائے وہ چاہتی تھی کہ ایک بار اس کی کڑوی جھیل کو بھی دیکھے کہ اس کا پانی کالا ہے یا سرخ؟ نیلا ہے یا سبزہ؟ لیکن ہائے اس کی آنکھیں! ایک دن تھا کہ اس کی غلافی آنکھوں میں جھیل وولر کی لطیف نیلاہٹ اور کچے باداموں کی نازک راحت ہوا کرتی تھی لیکن اب ان کی جگہ گہرے گہرے زخم تھے۔ جیسے دو اندھے اور تاریک کنوئیں کسی دور دراز ویرانے میں کھوئے پڑے ہوں ـــــ اب وہ اندھی تھی' بے بصر تھی' ایک بہادر ڈوگر نے اپنی سنگین سے اس کی آنکھوں میں بسے ہوئے طلسمی رنگ محل مسمار کر دیے تھے'

ساحل کے ہنگامے سے دور' ایک کالے رنگ کا جہاز سمندر میں تنہا کھڑا تھا اس پر سرخ رنگ کے جلی حروف میں لکھا تھا کہ اس میں بارود ہے۔ جب اس کی کشتی پاس سے گزرتی تو سیٹھ قائم علی دائم علی نے جلدی سے لڑکی کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ معاً اُسے ڈر لگا کہ کہیں یہ بارود بھک سے اڑ نہ جائے ـــــ جب کشتی ذرا دور نکل گئی تو سیٹھ قائم علی دائم علی نے پھر

اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر اپنی توند پر رکھ لیے۔

کشتی ایک چھوٹے سے جزیرے سے جا لگی۔ جزیرے میں چند ماہی گیروں کی جھونپڑیاں تھیں۔ ملاّح نے بتایا کہ اس عشرت کدے کا نام پیرس ہے۔ آس پاس اور بھی چند جزیرے تھے' ان کے ساحلوں پر بھی اِکّا دُکّا کشتیاں کھڑی تھیں۔ کہیں وینس تھا' کہیں نیپلز —— کہیں روم ——'

ملاح نے بادبان کھول کر کشتی پر ایک سائبان سا تن دیا۔ پھر اس نے سیٹھ قائم علی دائم علی کو آنکھ ماری۔ "لو سیٹھ' میں تو مچھلیاں پکڑنے چلا —— تم مزے سے کشمیر کی بہاریں لوٹو ——"

عید گاہ کے میدان میں ایک مینا بازار لگا ہوا ہے۔ یہاں ہر روز عید ہے ہر شب شبِ برات! ٹاٹ کی چھوٹی جھونپڑیوں میں ننھّے ننھّے چراغ ٹمٹما رہے ہیں۔ گوشت روٹی' سلے ہوئے کپڑے' پرانے بوٹ' تازے پھل' لوہے کی میخیں' لکڑی کے صندوق' چمڑے کی کرسیاں' تیل' اچار' صابن —— بے گھر اور بے در مہاجر سہارے کی ہر ممکن لڑی تھام کر بیٹھے ہوئے ہیں۔ ایک عجیب قسم کا اطمینان' ایک عجیب قسم کی ابدیت اس ماحول پر جاری و ساری ہے —— جسے دیکھ کر یہ گمان ہوتا ہے کہ زندگی کا یہ بھٹکا ہوا کارواں آخر اپنی منزل مقصود پر پہنچ گیا ہے۔

ایک جھونپڑی میں چادر تان کر دو حِصّے کیے ہوئے ہیں۔ سامنے کی

طرف دلشاد پکوڑیاں تل رہی ہے۔ پچھلی طرف زبیدہ دہی بڑے لگائے بیٹھی ہے۔

ایک لمبا تڑنگا پٹھان پکوڑیوں کے سامنے پھسکڑا مارے بیٹھا ہے۔

"گرم گرم پکوڑیاں ہیں' خان' ——— کھالو ——— بولو کتنے کی دُوں؟"

"نرم ہے' خو' گرم ہے؟" پٹھان نے آنکھ ماری۔

"ہاں خان! نرم ہے' خو گرم ہے!" دلشاد کڑچھی منہ کے سامنے کر کے مُسکرائی۔

دلشاد کی مسکراہٹ میں بھی عجیب جادو تھا۔ اس کی ایک مسکراہٹ پر نثار ہو کر رحیم خاں نے قسم کھالی تھی کہ اگر سورج یا چاند یا تارے بھی اُسے اٹھالے جائیں تو وہ ارض و سما کی وسعتیں پھاند کر اسے چھین لائے گا۔'

پٹھان نے ہونٹوں پر زبان پھیری۔ "خو ایک روپیہ؟"

"نہیں خان' خو پانچ روپیہ ———"

"ہٹ' خو' ڈھائی رَوپیہ؟"

"خو' پانچ۔"

پٹھان نے اپنی جیب کے پیسے گنے۔ اس کے پاس تین روپے چار آنے تھے اس نے پونے دو روپیہ کا ادھار کرنا چاہا لیکن دلشاد نے اُسے مجبور کر دیا کہ خان' قرض محبت کی قینچی ہے۔ تم پیسے پورے کر لاؤ۔ میں

تمہیں جھٹ پٹ نرم نرم، گرم گرم پکوڑیاں اتار دوں گی۔'

پٹھان مایوس ہو کر دوسری طرف چلا گیا۔ وہاں اس نے دہی بڑوں کا سودا کیا —— زبیدہ ابھی بچّہ تھی، نادان تھی، معصوم تھی، اس لیے وہ پونے دو روپے کا ادھار مان گئی۔

زبیدہ نے دلشاد کو آواز دی۔ "بہن ذرا اس طرف دھیان رکھنا محمود سو رہا ہے۔ میں ذرا خان کے ساتھ جا کر دہی لے آؤں۔"

اسی طرح جب دلشاد بھی اپنی پکوڑیوں کے لیے بیسن لینے کسی گاہک کے ساتھ جاتی ہے تو اپنی بچی کو زبیدہ کے سپرد کر جاتی ہے۔ دہی اور بیسن کی اس ملاوٹ پر دنیا کی سب سے بڑی اسلامی ملّت کا مستقبل پروان چڑھ رہا ہے۔ جب دلشاد کی بچی نرم نرم، گرم گرم پکوڑیوں پر پل کر جوان ہو گی۔ جب زبیدہ کا محمود دہی بڑوں کی چاٹ پر سیانا ہو گا، تو اسلام کی برادری میں دو گرانقدر رکنوں کا اضافہ ہو جائے گا۔ ایک مضبوط بھائی، ایک خوبصورت بہن —— جسم کی مضبوطی اور جسم کی خوبصورتی! یہی تو وہ نعمتِ عظمیٰ ہے، جو نعمتوں والے عظمتوں والے باری تعالیٰ نے تم کو عطا کی ہے۔ وہ تو بڑا ہی رحیم اور شفیق آقا ہے۔ وہی مشرق کا مالک ہے، وہی مغرب کا مولا ہے۔ اُسی نے درختوں پر خرمے اور انار لگائے۔ وہی دریاؤں سے موتی اور مونگے نکالتا ہے۔ وہی جنّت کا رحمان ہے، وہی دوزخ کا قہار ہے —— پھر تم اپنے پروردگار کی کِس کِس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟

کچھ "یا خدا" کے بارے میں

ستمبر 1947ء میں جب میں کراچی پہنچا، تو چاروں طرف سے لُٹے پٹے، کٹے پھٹے مہاجرین کا ایک سیلاب عظیم پاکستان میں امڈا چلا آ رہا تھا۔ انہی میں کہیں میرا ایک نہایت قریبی عزیز اپنی بیوی اور بچوں سمیت بھی شامل تھا۔ وہ کئی ماہ پہلے مشرقی پنجاب کے گاؤں چکور صاحب سے کسی قافلے میں روانہ ہوا تھا، اور ہمیں کچھ معلوم نہ تھا کہ وہ پاکستان تک زندہ سلامت پہنچا بھی ہے یا نہیں؟ اور اگر پہنچا ہے تو کہاں پر ہے؟

اس عزیز کی تلاش میں ایک ایک کر کے مَیں نے تقریباً تمام مہاجر کیمپوں کا بڑا تفصیلی جائزہ لیا۔ ہجرت کا اصلی اندازہ صرف وہی لوگ لگا سکتے ہیں جو خود اس بھٹی سے گزرتے ہیں۔ گھروں میں بیٹھ کر، یا دفتروں کی چاردیواری میں اعدادوشمار کے گوشوارے بنا کر، یا جلسوں اور جلوسوں میں دُھواں دھار تقریریں سُن کر ہجرت کا صحیح مفہوم سمجھ میں آتا ہے اور نہ ہی مہاجر خانوں میں سسکتے ہوئے، تڑپتے ہوئے، ایڑیاں رگڑتے ہوئے، اور اپنوں اور پرایوں کے ہاتھوں لٹتے ہوئے مہاجرین کی داستان پوری طرح سنائی دیتی ہے۔

اپنی اس تلاش کے دوران ظلم، بربریت اور مصائب کی چادر میں لپٹے ہوئے لاکھوں مہاجرین میری نظروں کے سامنے سے گزرے۔ ان میں ہزاروں کی تعداد میں بچے بھی تھے اور جوان اور بوڑھی عورتیں بھی۔ درجنوں نے تڑپ تڑپ کر، رو رو کر، بین کرتے کرتے مجھے اپنی بپتا بھری جیون کہانیاں سنائیں۔ اس کربناک مجموعی مشاہدے نے اندر ہی اندر سُلگ سُلگ کر آخر ایک روز دلشاد کا روپ دھار لیا۔ ایک شام میں قلم لے کر بیٹھا اور فجر تک ایک ہی نشست میں "یا خُدا" کی کہانی مکمل کر کے اٹھا۔

یہ طویل افسانہ سب سے پہلے "نیا دور" کے فسادات نمبر میں شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد احباب کا اصرار ہوا کہ ناولٹ کے طور پر اسے کتابی صورت میں بھی ضرور چھاپنا

چاہیے۔ محترمہ ممتاز شیریں مرحومہ نے ایک دیباچہ تحریر فرما دیا' اور "یا خدا" کا پہلا ایڈیشن کراچی سے جون 1948ء میں شائع ہوا۔ عام قاری کو یہ اتنا پسند آیا کہ دیکھتے ہی دیکھتے اس کے چھ ایڈیشن نکل گئے۔ لاہور کے ایک پبلشر نے اس ناولٹ کا نام "یا خدا" کی جگہ "آزادی کے بعد" رکھ کر بھی کچھ کاروبار کیا!

"یا خُدا" کے کتابی صورت میں شائع ہوتے ہی ترقی پسند مصنفین کی صف میں ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ کئی مہینوں تک بڑے بڑے مستند رسالوں میں اس کے خلاف خوب لمبے لمبے تنقیدی مضامین آتے رہے۔ میں نے کسی تنقید کا کوئی جواب دینا مناسب نہیں سمجھا۔ کیونکہ مجھے یقین تھا' کہ یہ نقاد اگر حق بجانب ہیں تو یہ کہانی بہت جلد مردہ ہو کر دفن ہو جائے گی۔ لیکن پچھلے 37 سال سے ایسا نہیں ہوا۔ مخالفانہ تنقید کسی کو یاد بھی نہیں۔ البتہ "یا خُدا" کے ایڈیشن پر ایڈیشن باقاعدہ شائع ہوتے رہے ہیں۔ اس میں میرا کوئی کمال نہیں۔ یہ اللہ کا فضل اور پڑھنے والوں کا کرم ہے۔

آج کل کالجوں کے نوجوان طلبہ کے کچھ طبقوں میں یہ کتاب خاص طور پر پسند کی جا رہی ہے۔ بہت سے لڑکے اور لڑکیاں "یا خُدا" کی جلدوں پر میرا آٹوگراف لینے آتے رہتے ہیں۔ ان میں سے اکثر حیرت سے یہ سوال پوچھتے ہیں۔ "کیا واقعی ہمارا وطن ایسے واقعات سے گزرا ہے جو اس کتاب میں درج ہیں؟ اگر یہ سچ ہے تو دوسرے ادیب کیوں نہیں لکھتے؟" وغیرہ وغیرہ۔

"یا خُدا" کے ماضی اور حال پر روشنی ڈالنے کے لئے میں یہاں پر تین دستاویزات کی نقول درج کر رہا ہوں۔

اول : محمد حسن عسکری کا خط مورخہ 20 جولائی 1948ء بنام محترمہ ممتاز شیریں

دوئم : اگست 1950ء کے ادبِ لطیف لاہور میں ابوالفضل صدیقی کا مضمون بعنوانِ "یا خُدا" اور اس کا دیباچہ۔

سوئم : "نوائے وقت" کے ایک نوجوان صحافی اظہر سہیل کے تاثرات جو لاہور' راولپنڈی' ملتان اور کراچی کے میگزین سیکشن 29 مارچ تا 4 اپریل 1985ء میں شائع ہوئے۔

محمد حسن عسکری کا خط

ممتاز شیریں کے نام
معرفت مکتبۂ جدید، انار کلی، لاہور
20 جولائی 48ء

محترمہ، آداب

اس وقت رات کا ڈیڑھ بجا ہے میں نے اسی وقت قدرت اللہ شہاب کی کتاب "یا خُدا" پڑھ کر ختم کی ہے۔ سب سے پہلے تو میں آپ کو ایسا "دیباچہ" لکھنے پر مبارکباد دیتا ہوں۔ آپ نے بڑے بے لاگ طریقے سے، اور بالکل بے جھجک حقیقت کا اظہار کیا ہے۔ آپ نے جس طرح فسادات کے متعلق انسانوں کا تجزیہ کیا ہے، وہ مجھے بہت پسند آیا، خصوصاً کرشن چندر کے متعلق تو آپ نے بڑی صاف گوئی سے کام لیا ہے۔ آپ نے قطعی طور پر ثابت کر دیا ہے کہ آپ کا ذہن ہر قسم کے تعصبات سے پاک ہے اور آپ کسی کی رُو رعایت نہیں کرتیں۔ ہمارے ادیب اس خوف سے اپنی زبان بند رکھتے ہیں کہ ہمارا کوئی ہندو دوست برا نہ مان جائے، یا ہمیں رجعت پسند نہ سمجھ لیا جائے۔ اس قسم کا خوف ہمارے قومی نقطۂ نظر سے جو کچھ بھی ہو، خالص ادبی نقطۂ نظر سے بھی بڑی پست چیز ہے۔ یہ دیکھ کر مجھے انتہائی مسرت ہوئی کہ ہمارے یہاں کم سے کم ایک لکھنے والے نے تو دیانت داری برتی۔ مَیں تو یہ ذرا بھی نہیں چاہتا کہ محض قومی فائدے کے لئے لوگ اپنی اصلی رائے کو چھپائیں یا حقیقت کو مسخ کریں۔ اگر ہمارے یہاں واقعی کوئی ایسا آدمی ہے جو Rimbaud کی طرح کا کوئی Vision اپنے اندر رکھتا ہے، اور وہ پاکستان کی بربادی کی دعائیں مانگتا ہے تو میں اس سے اختلاف رکھنے کے باوجود اسے سر آنکھوں پر بٹھاؤں گا۔ اسے اظہار کی پوری آزادی دوں گا، اور اس کے حق کی حمایت میں قائداعظم تک سے لڑنے کو تیار رہوں گا، مگر دُکھ تو اس بات سے ہوتا ہے کہ ہمارے ادیب محض دوسروں کو خوش کرنے کے لئے یا دوسروں کے کہنے سے پاکستان اور مسلمانوں کے خلاف نفرت یا کم سے کم بدظنی پھیلاتے ہیں۔ پاکستان حاصل کرنے کے لئے تو عوام

کے ووٹوں کی ضرورت تھی، ان پر نام نہاد Intellectuals کا کوئی اثر نہیں تھا۔ عوام نے پاکستان حاصل کر لیا، لیکن پاکستان کا استحکام محض ووٹوں سے تو نہیں ہو سکتا اس کے لئے تو پوری قوم کی ذہنی اور اخلاقی کاوش کی ضرورت ہے، اور زندگی کی چھوٹی سے چھوٹی باتوں سے لے کر بڑی سے بڑی باتوں تک میں پڑھے لکھے لوگوں کی پوری جدوجہد کے بغیر ہمیں استحکام کیسے حاصل ہو سکتا ہے؟ لیکن ہمارے ادیب ہیں کہ وہ پاکستان ہی کو ختم کرنے کے درپے ہیں، اور وہ بھی اپنے کسی فائدے کے لئے نہیں، محض غیر جانب داری، آزاد خیالی اور ترقی پسندی کا تمغہ حاصل کرنے کے لئے ----

ان حالات میں تو یہ بڑی مبارک فال ہے کہ آپ مسلمانوں کی طرف سے بولیں اور آپ نے اس سازش کا پردہ فاش کیا جو ادب کے پردے میں مسلمانوں کے خلاف ہو رہی ہے۔ اس پر آپ کو جتنی بھی مبارک باد دی جائے کم ہے، کیونکہ یہ بات تو ذرا مشکل ہی سے سمجھ میں آتی ہے کہ کوئی ادیب اس حد تک مسلمانوں کا حامی ہو، پھر آپ نے کوئی جذباتی بات بھی نہیں کہی، سیدھی سیدھی دو اور دو چار والی باتیں کی ہیں۔ میں اس بات کو پاکستان کے حق میں کوئی اچھی بات نہیں سمجھوں گا کہ پاکستانی ادیب ہر بات میں قوم یا حکومت کی حمایت کرنے لگیں، یا ہر بات کو صرف قومی مفاد کے نقطۂ نظر سے دیکھیں۔ میں تو صرف و محض معروضیت اور سچی غیر جانب داری چاہتا ہوں، اور قوم کی سچی تعمیر کا راز اسی میں سمجھتا ہوں۔ آپ کو معلوم ہو گا کہ آج کل فرانس میں ”ذمے دار ادب“ کا بڑا چرچا ہے۔ اس کے متعلق Ander Gide نے کہا تھا I Count only on the deserter میں تو اس مقولے کا بری طرح قائل ہوں۔ اگر میں اپنے لئے کسی شاندار مستقبل کا خواب دیکھتا ہوں تو ”وفادار“ کی حیثیت سے نہیں بلکہ بھگوڑے کی حیثیت سے۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ مجھے یہ بھی یاد ہے کہ Gide افریقہ میں Writer's Resistance Committee کا سیکرٹری بھی تھا (حالانکہ بعد میں آراگون صاحب نے بھی یہ مطالبہ کیا کہ ژید پر مقدمہ چلایا جائے، کیونکہ وہ جرمن سپاہیوں کے رویّے کی تعریف کرتا ہے)، تو ایسے نازک وقت میں تو ژید تک قومی خدمت پر آمادہ ہو گیا تھا، کیونکہ اس وقت ذہنی ایمانداری کا تقاضا یہی تھا۔ مگر ہمارے یہاں ایمانداری صرف اسی میں سمجھی جاتی ہے

کہ پاکستان کی مخالفت کی جائے یا جو ادیب ایسے ہیں جنہوں نے قہر درویش بجانِ درویش پاکستان کے وجود کو تسلیم کر ہی لیا ہے' وہ بے تعلق رہنا چاہتے ہیں' بلکہ پاکستان کی عملی حمایت کا مطلب جاہ پرستی سمجھتے ہیں۔ یہاں چند نوجوان ایسے ادیبوں کی ایک نئی انجمن بنانا چاہتے تھے جو پاکستان کے وفادار ہوں۔ مجھے اس بات سے بڑی خوشی ہوئی' مَیں نے تاثیر صاحب کو بھی شرکت کے لئے راضی کر لیا' لیکن جب یہ نوجوان قیوم نظر صاحب وغیرہ کے پاس گئے تو انہیں یہ جواب ملا کہ تاثیر اور عسکری کو کسی ملازمت کی تلاش ہے۔ ادیبوں کی انجمن بنا کے اپنا پروپیگنڈا کرنا چاہتے ہیں تاکہ لمبا ہاتھ مار سکیں۔ اب بتایئے کہ ایسے عالم میں آدمی کیا کرے کیا نہ کرے' ترقی پسندوں نے میرے بارے میں یہ اُڑا رکھا ہے کہ اسے حکومت سے پیسے ملتے ہیں۔ غرضیکہ بولیں تو یہ سب سُنیں' اور چپ کیسے رہیں' قوم کو مرتے ہوئے نہیں دیکھا جاتا۔ مجھے تو آپ کی یہ تحریر دیکھ کر بڑا تعجب ہوا۔ خدا کرے کہ آپ زیادہ لکھا کریں۔ ہماری ضرورت تو قوم کو اسی وقت ہے۔ کہیں تریاق بعد از وقت نہ پہنچے۔

قدرت اللہ شہاب کا افسانہ بھی مجھے بہت پسند آیا۔ میں تو کہتا ہوں کہ یہ کتاب ہر پاکستانی کے گھر میں ہونی چاہئے۔ اگر شہاب صاحب پسند کریں تو میری یہ رائے اپنی کتاب کے اشتہار میں دے دیں۔ میں اس پر اخبار ''امروز'' میں تبصرہ کر رہا ہوں کوشش کروں گا کہ زیادہ سے زیادہ اخباروں میں اس پر تبصرہ ہو جائے۔ خیر' یہ کوئی لافانی افسانہ تو نہیں ہے' مگر اپنے مقصد کے پیش نظر بڑا کامیاب ہے۔ آخر Vercors کی Silence of the Sea ہی کون سی لافانی ہے؟ یا اس قسم کی دوسری کتابیں؟ مگر پھر بھی ان کتابوں کا ایک مقام ہے' اور ان مصنفوں کی قومیں بجا طور پر ان کی شکر گذار ہیں۔ شہاب صاحب بھی اسی طرح ہمارے شکریے کے مستحق ہیں۔ زیادہ اچھی بات یہ ہے کہ انہوں نے غیروں کے مظالم دکھانے پر اتنا وقت صرف نہیں کیا' جتنا اپنوں کے مظالم پر کتاب کا تیسرا حصہ سب سے اچھا اور سب سے زیادہ با اثر ہے۔ خصوصاً آخری سین کی تو داد نہیں دی جا سکتی۔ میں کتاب پر مفصل تبصرہ کر رہا ہوں۔

خیر خدا کا شکر ہے کہ ہمارے ذہنوں پر سے ترقی پسندی کی دُھند تو چھٹنے لگی۔

شہاب صاحب کو میری مبارک باد پہنچا دیجیے۔

ذرا یہ تو بتائیے کہ کراچی کا ادبی ماحول کیسا ہے۔ کتنے لوگ پاکستانی ہیں اور کتنے ترقی پسند؟ ذرا جلدی جواب دیں تو اچھا ہے۔ صمد شاہین صاحب کو آداب۔

نیاز مند

محمد حسن عسکری

بشکریہ "نیا دور" کراچی

شمارہ 80 – 79

یا خُدا اور اس کا دیباچہ

ابوالفضل صدیقی

ادبی تخلیقات کی رفتار جتنی تیز ہوتی ہے اتنی ہی ان فنکاروں کی پیداوار میں کمی ہوتی جاتی ہے۔ جن کے یہاں انفرادیت ہوتی ہے اس دلچسپ حقیقت کو ہم نے اردو ادب میں بھی دیکھ لیا ہے۔ بیدی، کرشن چندر، عصمت اور دو ایک نام اس فہرست میں اور اضافہ کر لیجیے جنہوں نے اردو افسانہ نگاری میں انفرادیت کی کچھ ایسی مہرلگائی اور اپنی بے پناہ فکر و استعداد سے پیچھے آنے والے ادیبوں کو اس طرح متاثر کیا کہ 43ء کے بعد ہر نیا ادیب انہی افسانہ نگاروں کی دنیا میں کھو کر رہ گیا —— کرشن چندر، اَن داتا کے بعد آہستہ آہستہ انحطاط کی جانب مائل ہونے لگے۔ بیدی نے ادب کو کبھی کبھار کا مشغلہ بنا لیا اور عصمت جنس سے نکل کر جب مزدوروں اور کسانوں کی دنیا میں آئیں تو اپنے پیچھے چلنے والوں سے بھی پیچھے رہ گئیں۔ جب ہمارے ادب کا یہ حال ہو تو ایسی صورت میں جب کوئی بُت شکن اٹھ کھڑا ہوتا ہے تو اسے دیکھ کر خواہ بڑے پجاری اور پرانے بت کتنے ہی خفا اور جز بز کیوں نہ ہوں۔ لیکن ایک سچا نقاد داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ قدرت اللہ شہاب 43ء کے بعد کا ایک بہت بڑا بُت شکن ہے جس نے اپنے افسانوں سے صرف چونکایا ہی نہیں بلکہ بُتوں اور پجاریوں کی صفوں میں ایک عجیب انتشار سا بھی پیدا کر دیا ہے۔ اس کا آخری افسانہ "یا خدا" تو اس منزل کا سنگِ میل ہے جہاں پہنچ کر ہمیں نہ

معلوم کتنے لات و منات اور فنی پجاریوں کو تلملاہٹ محسوس ہوتی ہے۔ اس افسانہ پر جب لوگوں کی برہمی کا اظہار دیکھا تو میں نے اسے دوبارہ پڑھا کہ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ میں غلط طور پر اس سے متاثر ہو گیا ہوں اور تقاضائے بشریت کے تحت جذبات کی رو میں بہہ گیا ہوں اور افسانہ کے موضوع کی سنگین قسم کی رنگینی میں گُم ہو کر اسے اردو کے بہترین افسانوں میں سے ایک اور فسادات پر لکھے ہوئے افسانوں میں بہترین خیال کرنے لگا ہوں۔ لیکن آج پھر ایک بار بڑے فخر کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ نہ صرف میرا پہلا خیال صحیح ہی تھا بلکہ دوبارہ مخصوص نظر سے پڑھنے کے بعد میری رائے راسخ تر ہو گئی اور نہ صرف رائے راسخ تر ہو گئی بلکہ مجھے اس میں چند خوبیاں ایسی نظر آئیں جن پر پہلے مطالعہ میں نگاہ نہ پہنچی تھی اور اب مجھے کہنا پڑتا ہے کہ لوگوں کی برہمی کے پردے میں کچھ اور ہے جس کی تشریح کی مجھے ضرورت نہیں ہے۔ آخر یہ "یا خدا" پر برہمی کیوں؟ جب سجاؔد ظہیرؔ اور احمدؔ علی انگارے میں پرانی اقدار پر چوٹ کرتے ہیں۔ جب کرشن چندر بڑے بڑے اَن داتاؤں کی زراتی کا بھانڈا پھوڑتا ہے، جب عصمؔت لحاف کا موٹا پردہ چاک کرتی ہے اور منٹو ادبی بھٹی کے ہون کنڈے دُھواں اٹھاتا ہے تو آپ انہیں بڑا فنکار مان لیتے ہیں حالانکہ انہی افسانوں پر ایک خاص سکول کے افراد تلملا اُٹھتے ہیں۔ لیکن جب قدرت اللہ شہاب غریب، سڑے گلے سماج کے رستے ناسوُروں اور مبروص سیاست کے گینگرینوں (Gangrenes) کی پٹیاں ہٹا کر نقاب کشائی کرتا ہے تو وہ عقاب قسم کے لوگ بھی بگڑ جاتے ہیں جن کا دعویٰ ہے کہ وہ سورج جیسی حقیقت سے بھی آنکھیں چار کرنے کی تاب رکھتے ہیں۔ فنکار چند بندھے ٹکے ریاضیاتی فارمولوں کا پابند نہیں ہو سکتا۔ اگر وہ ایک فنکار ہے اور سچا فنکار تو اسے براہ راست زندگی اور اس کی پہنائیوں میں داخل ہونا پڑے گا اور اگر وہ صرف اخبار کے اعداد و شمار سامنے رکھ کر اپنے فارمولوں کی مدد سے " تقسیم" اور "ضرب" اور "ضرب" اور "تقسیم" کا عمل کرے گا۔ تو چاہیں اسے کچھ اور کہہ لیں لیکن وہ "فنکار" نہیں ہے اور ترقی پسند ادیب تو بالکل ہی نہیں ہے کیونکہ ترقی پسندی مصلحت کی قائل نہیں۔ یہاں زخموں پر پردہ نہیں ڈالا جاتا یہاں پھوڑوں کو دبایا نہیں جاتا۔ وہ انہیں عریاں کرتا ہے۔ خواہ سیاست اور مصلحت اندیشی چیخنے اور کراہتی ہی کیوں نہ رہے۔ حقیقی معنی میں ترقی پسند فنکار ایک ماہر سرجن کی طرح "چر" سے نشتر لگا

دیتا ہے۔

قدرت اللہ شہاب پر چونکہ نکتہ چینی کی جاتی ہے اسے میں وہ تنقید سمجھتا ہوں، جسے ادب کی تو بالکل ہوا ہی نہیں لگی۔ البتہ اس میں نہایت گہری قسم کی سیاسی دُور اندیشی کے نشانات ضرور پائے جاتے ہیں۔ مگر جب یہ تنقید کرنے والے اپنی ان تنقیدوں کے ادبی اصولوں پر مبنی ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں تو پھر داستان گوئی کے عشرت خانے سے نکل کر تنقید کے میدان میں آنے کو جی چاہتا ہے ایک ایسا قلم ہاتھ میں لے کر جو تلوار سے بھی زیادہ تیز ہو اور جو اس غلیظ تنقید کا خاتمہ کر دے۔ میں ایک افسانہ نگار اور ناول نویس ہوں۔ تخلیقی ادب کی میرے نزدیک اہمیت بھی زیادہ ہے اس لئے نہ تو تنقید کو میں اپنا ادبی مشغلہ بنا سکتا ہوں اور نہ ہر نئے اور پرانے ادیب و شاعر کی قسمت کا فیصلہ کرنے کی اجارہ داری کا بوجھ میرے نحیف شانے سنبھال سکتے ہیں۔ اس لئے میں قدرت اللہ شہاب کے کہنے والوں کے بارے میں کچھ کہنا نہیں چاہتا، مگر قدرت اللہ شہاب کے بارے میں چند باتیں کہنی نہایت ضروری سمجھتا ہوں اس لئے کہ میری ادبی ایمانداری اور فنی خلوص بار بار مجھے اکسا رہا ہے کہ اس ہنگامہ میں جب کہ سیاہ و سفید کی تمیز دنیا کے کسی شعبہ میں باقی نہیں رہ گئی تو کم سے کم ادب کے چشمہ کی صاف پھواروں کو ہر قسم کی آمیزش سے بچانا ہمارا نہ صرف ادبی بلکہ اخلاقی فرض ہے اور ایسے موقع پر چپ بیٹھے رہنا بھی ایک بڑا فنی جرم ہے۔

قدرت اللہ شہاب کی افسانہ نگاری اور میرا نام دیکھ کر ممکن ہے کہ لوگ پہلی نظر میں یہ خیال کریں کہ اس مضمون کے ترکش سے کوئی نیا تیر چھوٹے گا، لیکن جب وہ یہ مضمون پڑھیں گے تو انہیں بڑی مایوسی ہو گی کہ انہی کے گروہ کا ایک خادمِ ادب جس کا ترقی پسندی پر پورا ایمان ہے۔ آج اپنے ہی اصولوں کی بنا پر ایک سچی بات کہنے میں اس کی بالکل پروا نہیں کر رہا ہے کہ خود اس کے اپنے حلقہ سے کتنی آوازیں اس کے برعکس اُٹھ چکی ہیں۔

اس ہنگامہ نے مجھے قدرت اللہ شہاب کے تقریباً تمام پچھلے مشہور افسانے پڑھنے کے لئے اُکسایا۔ میں پچھلے دو تین سال سے ہر نئے اور پُرانے افسانہ نگار کی تخلیق کو ذرا غور کے ساتھ پڑھنے کی کوشش کرتا ہوں مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ کتنے افسانے ایسے ہیں

جو ادبی اور افسانوی معیار پر پورے اُترتے ہوں۔ میری رائے ناقص میں ان افسانوں کی تعداد بہت کم ہے۔ انہی معدودے چند افسانوں میں سے چند افسانے قدرت اللہ شہاب کی جدت و قدرتِ فکر کا نتیجہ ہیں۔

سب سے پہلی چیز جو شہاب کے یہاں ہمیں متاثر کرتی ہے وہ یہ ہے کہ ہر افسانہ نگار کی شخصیت ہمارے سامنے مکمل طور پر اُبھر کر آجاتی ہے اور افسانہ کے مطالعہ کے ساتھ ساتھ نکھرتی چلی جاتی ہے اور یہی ایک چیز ہے جس نے شہاب کو نہ صرف ایک کامیاب افسانہ نگار بنا دیا بلکہ ایک صاحب طرز ادیب اور ایک حساس شاعر کے ساتھ ایک منفرد انشا پرداز بھی بنا دیا اور ہر جہتی طور پر وہ ایشیا کا ایک عظیم فنکار ہے جس کے پاس گھلاوٹ اور شیرینی کے خوشگوار گھونٹ ہیں۔ جس کی آستینوں میں طنز و تشنیع کے تیز نشتر اور مسموم پیکان ہیں، جس کی دستار پر بانکپن اور تیکھے پن کے رنگین طرّے لہرا رہے ہیں اور اس کو یہ تمام چیزیں ان تمام افسانہ نگاروں سے ممیتز کرتی ہیں، جو سپاٹ اور بے جان طریقہ سے ایک ''اچھی بات'' کو پیش کر دینا ہی سب سے بڑی نیکی اور سعادت سمجھتے ہیں، ''اچھی بات'' کا تو میں بھی قائل ہوں لیکن ''اچھی بات'' اچھے طریقے سے پیش نہ کرنا بھی ''بُری بات'' سے کم نہیں، ادب میں موضوعات کچھ زیادہ مختلف نہیں ہوتے۔ ایک دور کے اکثر ادیبوں کا تجربہ اور مطالعہ تقریباً ایک ہی سا ہوتا ہے۔ لیکن ان کی تخلیقات میں جو چیز امتیازی شان پیدا کرتی ہے وہ ان کے پیش کرنے کا طریقہ ہوتا ہے۔ ادب میں ''ابلاغ'' کو بہت اہمیت ہے آپ کے پاس خواہ کتنا ہی عمدہ موضوع ہو لیکن اگر طرزِ ادا بھونڈا ہے تو صرف موضوع آپ کی ادبی تخلیق کو جاندار نہیں بنا سکتا۔ موضوع اور طرزِ اظہار کا جسم و روح والا رشتہ ہے اور وہ بھی خوشگوار تناسب کے ساتھ۔ موضوع اور فن کو جن ادباء نے صحیح طور پر جانا ہے ان میں یہ نوجوان افسانہ نگار بھی ہے پہلے پہل ادبی دنیا میں مَیں نے شہاب کے افسانے دیکھے تو باوجود نام کے نئے پن کے مجھے ان کی انفرادیت نے متاثر کیا اور سب سے شروع کی ہی چند چیزوں میں مجھے شہاب کے اندر مستقبل قریب کا ادبی بُت شکنؔ ابھرتا نظر آیا۔ یہ نوجوان فنکار جس سے میں باوجود اشتیاق ملاقات کے بھی ابھی تک نہیں مل سکا ہوں۔ افسانوں میں ہم سے اس طرح ملتا ہے کہ ایک حد تک اشتیاق ملاقات کی تشنگی تسکین بھی پا جاتی ہے اور تیز تر بھی ہو جاتی ہے میں

نہیں کہہ سکتا کہ جب میں قدرت اللہ شہاب سے ملوں گا تو مجھے مایوسی ہو گی یا مسرت! مگر اس میں شک نہیں کہ وہ قدرت اللہ شہاب جو اپنے افسانوں میں ہمیں چلتا پھرتا اینڈتا نظر آتا ہے جو اپنی کتابوں میں ہے

"یک چمن گل' یک نیستاں' نالہ ایک خمخانہ مے"

کبھی زہر خند ہنسی ہنستا' اور گاہے موسم بہار کے غنچوں والی لطیف مسکراہٹ مسکراتا' کبھی آگ برساتا' اور کبھی گل فشانیاں کرتا نظر آتا ہے۔ قدرت اللہ شہاب تو ضرور اس قابل ہے کہ ہم اس سے محبت کریں۔

"محبت" کا لفظ مَیں نے خوب سوچ سمجھ کر استعمال کیا ہے اس لئے کہ قدرت اللہ شہاب اپنے افسانے کے کرداروں کو ہم پر مسلط کر کے ہمیں متاثر نہیں کرتا بلکہ افسانوں کے کرداروں سے زیادہ اس کا طرزِ ادا خود افسانہ نگار کی شخصیت کو ہم پر سوار کر دیتا ہے۔ یہ ہے کچھ عجیب سا پہلو' شہاب کی بے پناہ فنکاری کا۔ اور اس مخصوص صفت میں ہمیں دورِ موجودہ میں اپنی صف میں صرف وہ تنہا ہی نظر آتا ہے۔ شہاب اپنی ادبی تخلیقات میں نہ تو ہمارے پاس ایک بزرگ و رہنما پیغمبر کی صورت میں جلوہ افروز ہوتا ہے جس کو دیکھ کر سوائے زانوئے ادب تہ کرنے کے اور کچھ ہمارا فرض ہی نہ ہو اور نہ ایسا بانکا سپاہی جو اتنا طرار ہو کہ اس سے ہر وقت یہ خطرہ محسوس ہوتا ہو کہ نہ معلوم کس وقت اس کی تلوار ہمیں زخمی کر دے۔ اور نہ ہاتھ میں پوائنٹر لئے بلیک بورڈ کی طرف اشارہ کر کے لیکچر دیتا ہوا' سکول ماسٹر ہوتا ہے۔ ان افسانوں کا شہاب تو ایک "یار" کی صورت میں سامنے آتا ہے اور رخصت ہوتے وقت ایک جدید قربت' ایک نئی ہم آہنگی' ایک مزید خلوص چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔

قدرت اللہ شہاب کے افسانے پڑھتے وقت ہم خود کو محسوس نہیں کرتے بلکہ اس کے بیان کا طرز ہم پر کچھ ایسا سحر طاری کر دیتا ہے کہ ہم کو ذہنی طور پر ہی نہیں صریحاً مادی طور پر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شہاب ہمارے گلے میں بانہیں ڈالے ہمیں اپنی دنیا میں لئے پھر رہا ہے وہی دنیا جہاں "تلاش" ہے۔ جہاں بے بس و مجبور روحِ انسانی چیخ چیخ کر کہہ رہی ہے کیا مجھے سچی محبت کبھی نہ مل سکے گی؟ جہاں سب کا مالک بنگال کی گنگناتی ہوئی وادیوں میں بھوک کی کھیتیاں اُگاتا ہے اور جہاں رینا بوس مالک کے سامنے بل کھا کھا

کرناچتی اور اہلِ ہوس کی ہوس صرف اس لئے بھڑکاتی ہے کہ اس کو بھوک کی موت کے چنگل سے ہوس کے سیاہ دامن میں پناہ مل سکے۔ یہ دنیا ہمیں جلترنگ' سٹینوگرافر' غریب خانہ' ایک رات کی بات' ماما' اور دور نگاہ کے محوروں پر گھومتی سینما کے سکرین کی طرح ہمارے سامنے آتی ہے ان افسانوں میں ہمیں ایک زبردست طنز ملتا ہے۔ جس کے تیکھے پن کی نشریت نہ صرف شہاب کو رومانیت کے کوچے ہی سے نکال لاتی ہے بلکہ یاسیت کے گھروندوں کو بھی پاش پاش کر دیتی ہے۔ شہاب کے یہاں نمایاں شخصی انفرادیت ہے۔ لیکن وہ انفرادیت نہیں جو عام انفرادیت پسند ادباء کے یہاں پائی جاتی ہے وہ گھٹن اور تلخی' اور ابہام جو ان افسانہ نگاروں کا طرۂ امتیاز ہے۔ شہاب کے یہاں بالکل نہیں ہے اور سماجی احساس سے ہٹ کر چلنے کی روش کا کہیں پر پتہ نہیں ہے۔ شہاب کے افسانے سماج کے لوگوں کے ساتھ رہ کر اور اپنے مسائل کو ان کے مسائل کے ساتھ ہی ٹکرا کر لکھے گئے ہیں۔ ان میں چلتا پھرتا اصل انسان ہی ملتا ہے ان کے کردار خوابوں کی مخلوق نہیں' بلکہ وہ ایک طبقہ کی نمائندگی کرتے ہیں۔ وہ طبقہ جو داخلی طور پر خوش نہیں ہے جس کے سفید لباس کے نیچے بھی زخموں سے چور بدن ڈھکا ہوا ہے جہاں کوڑھ کے بڑے گھناؤنے داغ ہماری آنکھوں کو بند کر لینے پر مجبور کرتے ہیں جہاں کوٹوں کے نیچے بھوکے پیٹ پناہ لئے ہوئے ہیں۔ جہاں دُور نگاہی کی روحانی اور جسمانی برص کے دھبے داخلی اور خارجی تعفن سے شامہ و باصرہ پر ضرب کاری کرتے ہیں جہاں اپنی محبوباؤں کے جسم دوسروں کے بستروں کی زینت بنتے ہیں اور خود افسانے کے ہیرو اپنی راتیں دفتر کے کلرکوں اور چپڑاسیوں کی' بیویوں اور بیٹیوں کے ساتھ گزارتے ہیں۔ عورت! روپوں کی بھری تھیلی! چھوکری کا بھرا ہوا جسم یہ ہے وہ دنیا جہاں قدرت اللہ شہاب ہمیں لے جاتا ہے۔ جہاں پہنچ کر ہم تقاضائے فطری کے تحت آنکھیں بند کر لینے پر مجبور ہوتے ہیں تو کبھی بے ساختہ نتھنوں میں انگلیاں ٹھونس لیتے ہیں' وہ کہیں ہمارے باصرہ کو خیرہ کرتا اور کہیں ہمارے شامہ کو زیروزبر کرتا ہمیں لئے چلا جاتا ہے اور ہم بیزاری اور اختلاج کی حالت میں اس کے ساتھ چلے جاتے ہیں۔ یہ وہ دنیا ہے جسے دیکھ کر ہماری رگ رگ میں کراہت' نفرت اور بیزاری کا شدید احساس ابھرتا ہے۔ یہ وہ دنیا ہے جہاں کی شرع میں سُور کے گوشت سے لے کر چیل کے انڈے تک ہر چیز حلال ہے۔ قدرت اللہ شہاب ہمیں رنگ محل

دررنگ محل، شیش محل، درشیش محل لئے لئے نہیں پھرتا۔ اس کی دنیا میں غریب خانہ بھی ہے جہاں تھالیوں میں لوگ کتوں کی طرح سپڑ سپڑ کھاتے ہیں اور "غریب خانہ" میں ہمیں مینڈک کی طرح رینگتی ہوئی بوڑھی عورتیں، رعشہ براندام بوڑھے، پھولے ہوئے پیٹ، گڑگڑاتے ہوئے بچے، کھکھیاتے ہوئے ہڈیوں کے ڈھانچے اور وہ نوخیز لڑکیاں جن کو پیٹ کی بھوک مٹانے کے لئے جنسی بھوک مٹانا پڑتی ہے، ملتی ہیں، غریب خانہ وہ جگہ ہے جہاں بڑے میاں سے لے کر سقہ اور مہتر تک ہر نوجوان لڑکی پر اپنا حق سمجھتے ہیں اور جب الھڑ دوشیزہ اپنی دنیا سے بھاگ کر شہاب کی دنیا والے غریب خانہ میں پناہ لینا چاہتی ہے تو سہارے کی ہر ڈوری کے دوسرے سرے پر ایک ننگا سا وحشی، حیوان کھڑا ہوتا ہے۔ اس دنیا کی کامنی کوشل جب اپنے ٹھاکر کے پنجے سے نکل کر بھاگتی ہے اور یہاں آکر پناہ لینا چاہتی ہے، تو بقول شہاب وہ کسی چیز سے ٹکراتی ہے اور منہ کے بل گر پڑتی ہے۔ اور شہاب نہایت خلوص کے ساتھ۔ شروع سے آخر تک گلے میں بازو حمائل کئے کہیں انگلی کے اور کہیں ابروہی کے اشارے سے اور کہیں کہیں نہایت آہستہ آہستہ سے کانا پھوسی کرکے ہر چیز دکھاتا جاتا ہے اور نہایت سلامت روی کی چال سب کچھ بتاتا چلا جاتا ہے۔ آؤ یہ دیکھو یہ میری دنیا۔ کوڑوں کے انبار والی دنیا، سماجی بھوکوں، سیاسی بھوکوں، اقتصادی بھوکوں والی دنیا، جنسی بھوکوں اور شکمی بھوکوں والی دنیا۔ نہایت معمولی سی بات کی طرح بغیر مسکرائے غضب کی ڈھٹائی سے، بغیر پیشانی پر ایک ادنیٰ سی بھی چیں لائے ہوئے، بلا کی ستم ظریفی کے ساتھ ناظر کے حلق پر کونین کی تہ پر تہ چڑھاتا بڑے انداز میں چلا جاتا ہے۔

میں نے جب شہاب کے یہ افسانے پڑھے تو مجھے ایسا معلوم ہوا کہ یہ افسانہ نگار زبردست لاشعوری جرأت اور خداداد بے باکی کا حامل ہے اور اپنی انگلیوں میں داؤدی معجزہ لے کر آیا ہے جو لوہے کو موم کی طرح گوندھ کر اپنی مرضی کے مطابق زنجیر تشکیل کر دیتا ہے۔ اس لئے کہ اس نے اپنے لئے جو موضوع انتخاب کیا ہے اس میں حسن و رعنائی کے بجائے کوڑھ کے بدنما داغ ہیں، روحانی جذام اور جسمانی جذام کی بہتی ہوئی پیپ جس پر مکھیوں کے چھتے بھنبھناتے ہیں افلاس کی سیاہیوں کے بادل منڈلاتے ہیں اور گناہوں کی تاریکیوں کی اندھیریاں پڑی ہوئی ہیں۔ یہ ایک بہت نازک مقام ہے اور جب ایک افسانہ نگار ان چیزوں کو اپنے یہاں جگہ دیتا ہے اسے بہت چاق و چوبند ہو کر اور اپنی صلاحیتوں کو

بھرپور کام میں لا کر افسانہ لکھنا پڑتا ہے کیونکہ موضوع کی غیر شعریت اور بے رنگی جو کرداروں اور ماحول کی کراہتوں کی صورت قاری کے سامنے آ کر سرے سے انہیں پڑھنے سے ہی روکتی ہے چہ جائیکہ دلچسپی کے ساتھ مطالعہ کرے اور مَیں بھی شہاب کے افسانے ہرگز نہ پڑھتا اگر ان میں بے پناہ خلوص اور اسٹائل میں اس غضب کی جان نہ ہوتی۔ اس تاریک دنیا کو شہاب کے جاندار اسٹائل نے' اور اس پرخلوص زورِ بیان نے اس قدر روشن اور گوارا بنا دیا ہے کہ بے اختیار شہاب سے محبت کرنے کو جی چاہتا ہے۔ کشمیر کی فردوسی وادیوں اور پنجاب کے وسیع میدانوں کے متعلق سبھی افسانہ لکھتے ہیں اور جنسی جذبات کو اُبھار کر اپنی کہانیوں میں لذت پیدا کر لینا تو ایک عام رسم اور سہل نسخہ ہے لیکن ایسی کریہہ دنیا پیش کر کے اور ہمیں اس دنیا میں دوش بدوش اپنے ساتھ ایسے چلاتا جیسے ہم ہالی ووڈ اور بمبئی کے اسٹوڈیو میں گھوم رہے ہیں یا سوئزرلینڈ اور کشمیر کی وادیوں کا چکر لگا رہے ہیں۔ آج کل کے افسانہ نگاروں میں صرف قدرت اللہ شہاب کی انگلیوں کا معجزہ ہے۔ میں کسی قسم کے تعصب کی بنا پر نہیں کہہ رہا ہوں آپ ہی بتایئے کہ کرشن چندر سے کشمیر کی رنگین وادیاں چھین لی جائیں اور ندیم سے پنجاب کے گنگناتے روشن میدان لے لئے جائیں' شفیق الرحمٰن سے دیرہ دون اور شملہ کے ہرے بھرے نشیب و فراز نکال لئے جائیں' عصمت' منٹو اور مفتی کے یہاں اعصابی تشنج نہ ہو تو کیا آپ ان کے افسانوں کو پڑھیں گے۔ یہ ایک بہت بڑا سوال ہے جس کا پوچھنا میری جرأت رندانہ ہے اور جس کا جواب بھی کچھ دل گردے والا انسان ہی دے سکتا ہے۔ خوبصورت اور جذباتی موضوعات پر افسانہ لکھ کر مقبول ہونا تو بہت آسان ہے لیکن گھناؤنے موضوعات کو کریدٗ کر مقبول اور ہردلعزیز بنانا صرف شہاب ہی کے زورِ قلم کا حصہ ہے اور یہ قلم اس وقت تک نصیب نہیں ہو سکتا جب تک کہ ایک افسانہ نگار کی شخصیت میں وہی بانک پن اور ویسے ہی ہمدردی اور خلوص نہ ہو' جو شہاب کے اندر ہے۔

اب کچھ "یا خدا" کے متعلق! شہاب کا یہ افسانہ نہ صرف اس کے پچھلے تمام افسانوں میں بڑھ چڑھ کر ہے بلکہ اس کا شمار زبانِ اردو کے بہترین افسانوں میں کیا جا سکتا ہے۔ جس طرح قحطِ بنگال کے افسانوں میں کرشن چندر کا "اَن داتا" سب سے زیادہ بھرپور اور مؤثر افسانہ ہے۔ اسی طرح قدرت اللہ شہاب کا "یا خدا" فسادات پر لکھے ہوئے

افسانوں میں ہے۔ "یا خُدا" فسادات پر لکھے ہوئے افسانوں کا بادشاہ ہے۔ اس کے اندر وہ بے پناہ حقیقت نگاری اور ایسی شدید روح ملتی ہے کہ بعض مصلحت اندیش لکھنے والے اس پر ارتداد و کُفر کا فتویٰ صادر کر بیٹھے۔ اپنی عمر میں جن معدودے چند چیزوں سے قاری انتہائی متاثر ہوا کرتا ہے۔ ان میں ایک "یا خُدا" بھی ہے۔ لیکن جب ظہیر بابر اور مجتبیٰ حسین کے مضامین دیکھے تو مجھے یہ خوف ہوا کہ کہیں میں غلط راہ پر تو نہیں جا پڑا ہوں۔ جذبات کی رو میں کہیں رجعت پسندی کا تو شکار نہیں ہو گیا ہوں۔ لیکن جب مَیں نے "یا خدا" کا دیباچہ اور یہ مضامین پڑھے تو یہ محسوس کیا کہ ان مضامین اور دیباچہ کو "یا خُدا" سے کوئی علاقہ نہیں ہے کیونکہ دیباچہ میں "یا خُدا" کے متعلق کہنے کی بجائے کچھ اور کہا گیا ہے اور مضامین میں "یا خُدا" سے زیادہ دیباچہ پر بحث کی گئی ہے اور اصل مصنف سے زیادہ دیباچہ نگار پر نکتہ چینی کی گی ہے اور کچھ ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ قدرت اللہ شہاب بے چارے ایک جانب سے آلہ کار ہیں اور دوسری جانب سے چکی کے دو پاٹوں میں گیہوں کے ساتھ گھُن بن کر پسے گئے ہیں اور ان پر کسی اور جذبے کے تحت تیر و نشتر چلائے گئے ہیں اور اس بے مثال افسانہ میں فرقہ پرستی کے ناپاک جراثیم تلاش کئے گئے ہیں اس میں شک نہیں کہ افسانہ کا فریم دیکھ کر پہلی نظر میں ضرور یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس تصویر میں چالاک سیاست دان کی طرح ایک ہی رخ پیش کیا گیا ہے اس کے پیش کرنے والے کے خلوص میں مجھے ذرہ برابر بھی شبہ نہیں ہے۔ فنکار کے قلم نے صرف ان احساسات کی عکاسی کی ہے جو ایک مخصوص ماحول میں' ایک خاص طبقہ کی نمائندگی کرنے والے کردار سے وابستہ ہیں۔ ہندوستان اور پاکستان میں جو فرقہ وارانہ فسادات ہوئے ان میں ظالم و مظلوم کی تمیز اٹھ گئی تھی۔ ظالم اِدھر بھی تھے اور ظالم اُدھر بھی اور جانبین میں سے کسی ایک کی بھی یہ منطق ظلم کے لئے وجۂ جواز نہیں ہو سکتی کہ پہلے اقدام کس کی جانب سے ہوا۔ ہر ہر مہادیو اور نعرۂ تکبیر کے نعروں اور جے کاروں میں مٹنے والے وہ مظلوم تھے جنہیں الگ الگ نہیں کیا جا سکتا۔ اگر ایک ماحول کا مصنف صرف اپنے ماحول کے مظلوموں کی عکاسی صحت نیت کے ساتھ کر دیتا ہے تو اس کے یہ معنی کب ہو گئے کہ اس کے ماحول کے حدود کے باہر مظلوم ہیں ہی نہیں۔ ترقی پسند نقطۂ نظر تو یہ کہتا ہے کہ ہم اس کی تخلیق کو اس بات کے پیشِ نظر جانچیں کہ آیا فنکار کہیں جھوٹ تو

نہیں بول رہا ہے یا اپنے ماحول کی عکاسی کرتے ہوئے کسی سچی بات سے چشم پوشی تو نہیں کر رہا ہے اور اس تصویر کے پیش کرنے میں کہیں افراط و تفریط سے تو کام نہیں لے رہا ہے۔ شہاب کے اس افسانہ کو پڑھ کر جو لوگ اس میں فرقہ واریت کے کیڑے دیکھتے ہیں وہ دراصل حقیقت سے آنکھیں چُراتے ہیں۔ حقیقت کو پیش کر دینے سے خواہ لوگوں کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں یا حلق کڑوے ہو جائیں لیکن حقیقت تو حقیقت ہے اور اس کی تلخی یا تُرشی مسلّم اسے شیریں بنانا کسی کے بس کی بات نہیں۔ "یا خُدا" میں صرف ان لوگوں کو فرقہ پرستی کے کیڑے ملتے ہیں جو یا تو مصلحت اندیش ہیں یا پھر جو ان فسادات میں آگ اور خون کی دنیا سے بہت دور بیٹھے صرف پریس کی مدد سے اپنی معلومات میں اضافہ کرتے رہے اور رائیں قائم کرتے رہے اور اخباری دوربینوں سے مشاہدہ کر کے افسانے لکھتے رہے اور نہایت سستی قسم کی موٹی مصلحت اندیشی کے تحت جانبین کے ظالموں اور مظلوموں میں توازن رکھتے ہوئے' دونوں قوموں میں صلح کرانے کا فورتھ کلاس قسم کا پروپیگنڈا کرتے رہے۔ خیر ان افسانہ نگاروں کے جذبہ کو مطعون نہیں کیا جا سکتا کم از کم اس کے اندر سطحی معصومیت ضرور ملتی ہے اور اگر اس سے قوم کی حالت سدھر سکتی ہے اور نفرت کی آگ ٹھنڈی ہو سکتی ہے تو ایسا ضرور کرنا چاہئے لیکن ہر فنکار سے یہ اُمید کرنا کہ وہ اپنے مزاج کو بدل کر اور اپنے اوپر اعتدال و توازن کا خول چڑھا کر اس نیک کام میں ان کا ہاتھ بٹائے تو یہ چیز بہت بے معنی ہے یہ ایک ٹھنڈی طبیعت کا ادیب تو کر سکتا ہے لیکن شہاب جیسا شعلہ مزاج اور تُند طبیعت نوجوان فنکار اس پر کیسے قادر ہو سکتا ہے' جسے اپنا خلوص اس قدر عزیز ہے کہ خود اپنی تلاشی لیتے ہوئے بھی اُسے باک نہیں ہے ایسے ادیب سے یہ امید کرنا کہ وہ اپنی نوکِ قلم بجائے حقیقت کی آگ کے مصلحت کی برف میں ڈبو کر لکھے' فضول ہے کیونکہ اس کے پچھلے افسانے یہی ظاہر کرتے ہیں کہ اس کے اندر مصلحت (Compromise) کے عناصر پیدا ہی نہیں ہو سکتے۔

وہ اس مقدس آگ کے دبانے سے مجبُور ہے جو انسانیت سوز آگ کے شعلوں کو دیکھ کر ایک فنکار کے اندر بھک سے بھڑک اٹھتی ہے اور اس شعلہ فشانی کے بغیر شہاب زندہ نہیں رہ سکتا۔ "یا خدا" میں اس کے احساسات کی یہ آگ اپنی انتہا کو پہنچ گئی ہے۔ یہاں تک کہ لوگوں نے اس کی وسیع انسانی ہمدردی کے جذبہ کو غلط سمجھ کر بدحواسی میں

اسے فرقہ پرست کہہ دیا لیکن میں پھر سوچتا ہوں اور بار بار میرے ذہن میں ایک بات کھٹکتی ہے کہ قدرت اللہ شہاب پر یہ تمام عتاب اس لئے نازل ہوا ہے کہ محمد حسن عسکری اور ممتاز شیریں نے اس کو سراہا ورنہ "یا خدا" کی نوعیت وہی تھی جو خواجہ احمد عباس کے "سردار جی" کی تھی۔ بلکہ میں یہ کہوں گا کہ "سردار جی" میں تو ایک تشنگی کا احساس باقی رہ جاتا ہے اس میں کوئی بھرپور کردار ملتا ہے' اور نہ ہی ایسی فضا جس کے مطابق ہم ماحول کا تجزیہ کر کے اس چیز پر مطمئن ہو سکیں جو فنکار کہنا چاہتا ہے۔ سردار جی" کا آخری حصہ تو اتنا غیر فطری اور بے جان ہے کہ مصنف کی مصلحت اندیشی اور توازن قائم کرنے کا پول نہایت پھُس پھُسے طریقے سے کھل جاتا ہے اور افسانہ ایک بچگانہ کوشش بن کر آپ اپنا مذاق اڑانے لگتا ہے۔ اس افسانہ کی ابتدا میں سکھوں سے جو نفرت کا جذبہ ابھرتا ہے وہ "سردار جی" کے خاتمہ پر زائل نہیں ہوتا کیونکہ اس کا خاتمہ بہت کمزور ہے اور بچوں کے بہلانے کا جھن جھنا سا بجتا سنائی دیتا ہے۔ شہاب کے افسانہ کو غور سے پڑھنے کے بعد یہ پتہ چلتا ہے کہ اس میں ایک زندہ سماں ہے اور اس کی فضا میں آپ کو شروع سے آخر تک نہایت خوبصورت یکسانیت ملتی چلی جاتی ہے اور ایک ایسا تجزیہ جس کی روشنی میں نہ صرف آپ کو فسادات کا صحیح پس منظر معلوم ہو جاتا ہے بلکہ اس گھناؤنے ماحول سے نفرت ہونے لگتی ہے اور اس نفرت کو اُبھارنا اور اُجاگر کرنا ہی مصنف کا سب سے بڑا مقصد ہے۔ شاید ترقی پسند نقاد اس افسانے پر لکھتے وقت یہ بھول جاتے ہیں کہ لینن نے کہا ہے "اگر اپنے ماحول کو بدلنا ہے تو سب سے پہلے اس ڈھانچہ سے نفرت کرو" قدرت اللہ شہاب جب بھی نفرت کا جذبہ اُبھارتا ہے تو کیا اس کا یہ فعل عین ترقی پسند نہیں ہے۔ فرقہ پرستی کے جراثیم کو ختم کرنے کے لئے صرف دلّی کے گورنمنٹ ہاؤس میں بیٹھ کر صلح کی بات چیت کرنا ہی کافی نہیں ہے کیونکہ فسادات کی بنیاد صرف مذہب یا عقیدہ نہیں ہے اس کی تہ میں بہت سے عناصر کارفرما ہیں۔ عناصر دونوں جگہوں پر یکساں ہیں اور انہی سے مل کر یہ ماحول بنا ہے اس لئے جب تک ان بنیادی عناصر سے نفرت پیدا نہ کی جائے اس وقت تک اس ماحول کا پردہ چاک نہیں ہو سکتا اور اصل جراثیم نہیں مٹ سکتے۔ "یا خدا" کے مصنف کا سب سے بڑا فنی کمال یہ ہے کہ اسے پڑھ کر ہندو یا سکھ سے من حیث القوم نفرت کا احساس بیدار نہیں ہوتا بلکہ خنجر

بھونکنے والے سے زیادہ خنجر بھونکنے کے عمل اور وحشت و بربریت کی جانب ہم متوجہ ہوتے ہیں دلشاؔد سے ہمیں اس لئے بڑی ہمدردی نہیں ہوتی کہ وہ ایک مسلمان لڑکی تھی اور ملا علی بخش کی بیٹی تھی بلکہ شہاب کے خلوصِ بیان نے اسے اس طرح پیش کیا ہے کہ پڑھتے وقت ہم یہ تو بالکل فراموش کر بیٹھے ہیں کہ وہ کون ہے وہ ہمیں صرف ایک معصوم لڑکی دکھائی دیتی ہے جسے چند وحشی درندے نوچتے دکھائی دیتے ہیں اور کچھ طرزِ بیان کا جادو ہم پر ان درندوں کے اس طاغوتی فعل سے ایسا جذبۂ نفرت اور لڑکی کی مصیبت پر اپنی ہمدردی بیدار کرتا ہے، کہ ہم شیطانی عناصر کے خلاف کمربستہ ہو جاتے ہیں اور یہی ایک فنکار کا سب سے بڑا کمال ہے کہ اس کا مقصد قاری کے اندر رچ کر رہ جائے اور جب دلشاؔد کو عمل کے آثار نظر آتے ہیں تو اس کی حالت قابلِ رحم ہو جاتی ہے اور ہم بلک بلک اٹھتے ہیں مگر ہمیں اس کا احساس تک نہیں ہوتا کہ یہ مظالم ایک کلمہ گو خاتون پر ٹوٹ رہے ہیں بلکہ دلشاد کے کردار کا نقشہ ہماری آنکھوں کے سامنے ایک رینگتی ہوئی مخلوق جیسا پیش ہوتا ہے جسے "عورت" کہتے ہیں اور پھر عورت بے بس و مجبور، عصمت و عفت کی دیوی، جس کے بطن کا مقدس صندوق خالقِ مطلق نے اپنی تخلیقی شاہکار کی امانت کے لئے منتخب کیا ہے اور دلشاؔد کا بچہ ہمارے سامنے صرف ایک ناجائز اولاد ہی کی شکل میں نہیں آتا بلکہ اس وحشت اور بربریت کی زندہ تشکیل ہے۔ جب انسانیت دشمن بوالہوس انسان نما درندے، انسانی تہذیب و تمدن کے تمام سرمایہ کو ملیا میٹ کر کے اپنی ہوس کی آگ بجھاتے ہیں۔ یہ دلشاؔد اگر گیتاؔ یا سیتاؔ ہوگی تو بھی کوئی خاص فرق نہیں پڑے گا۔ یہ مریک سنگھ اور دربار سنگھ اگر شہباز خان اور گلزار خان ہوں گے تو اس عمل میں ماحول کے لحاظ سے ایک ہلکا سا فرق محسوس ہو سکتا ہے۔ لیکن گیتاؔ اور سیتاؔ کی مظلومیت بھی اسی نوعیت کی ہوگی، جیسی دلشاؔد کی تھی اور ان کی ناجائز اولاد بھی اسی طرح انسانیت کے نام پر طنز و تشنیع کا ایک تیر پھینکتی اور پکار پکار کر کہتی "او میاں ہندوستانی صاحب! دیکھو ہم ہیں بیسویں صدی کی آئینی اور اخلاقی دنیا کے روشن اور سفید صفحہ پر تمہارے ٹپکائے ہوئے کالے دھبے، وہ دھبے جن کی مثال ہندوستان سے باہر اس صدی میں باوجود دنیا کی دو عظیم جنگوں کے بھی کہیں اور نہیں ملتی۔"

"یا خدا" کو پڑھ کر اور اس کے ماحول کا تجزیہ کر کے قاری کے اندر ایک وسیع

انسانی ہمدردی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ اس کی بنیاد سکھ اور مُسلم پر نہیں بلکہ ظالم اور مظلوم پر ہے اس کے کردار اپنے ماحول کے لحاظ سے اپنا عمل کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ اس ماحول کو خواہ یو پی میں رکھ لیجئے چاہے بہار میں یا بنگال' آسام اور سندھ میں' اس کی بنیاد نہیں بدل سکتی۔ البتہ دلشاؔد اپنا نام بدلتی جائے گی۔ وہ کہیں گیتاؔ ہوگی اور کہیں سیتاؔ اور کہیں سعیدہ اور کہیں رقیہ' مگر اس کے ساتھ چند درندے بیدردی سے انسانیت کی بے گور و کفن ننگی لاش کی بوٹیاں نوچتے نظر آئیں گے۔ اب بتایئے کتنا بڑا ظلم ہے اور افسانہ نگار کی کاوشوں کی کتنی بڑی بے قدری ہے جب آپ اپنی خاص عینک سے دلشاؔد کو صرف مسلمان ہی سمجھ لیں حالانکہ "یا خُدا" کے خلوص بیان اور ترقی پسند تنقید نگاری کا تقاضا یہ تھا کہ دلشاؔد صرف ایک عورت کی صورت میں نظر آتی۔ ایک مظلوم و بے بس عورت! ——— ان کے دل میں دلشاؔد سے ہمدردی کرتے وقت خود مسجد اور گردوارے کے جھگڑے کھڑے ہو جاتے ہیں تو وہ اپنے دل کا چور مصنف کے سر تھوپ دینا چاہتے ہیں۔ حالانکہ تصنیف میں کوئی ادبی نشان بھی اس قسم کا نظر نہیں آتا۔ ایک بات اور قابلِ افسوس ہے کہ اس افسانے کو شائع کرتے وقت قدرت اللہ شہاب نے ممتاز شیریں سے دیباچہ لکھوایا۔ مگر انہوں نے بھی مصنف اور تصنیف دونوں کے ساتھ خلوص کا ثبوت دیا جو شیریںؔ جیسی ممتاز اور بلند پایہ فنکار کے کسی صورت سے بھی شایانِ شان نہ تھا۔ انہوں نے بجائے اس کے کہ اپنی ناقدانہ قوتیں افسانہ کے حسن و قبیح پر صرف کرتیں بلکہ ترقی پسندوں کے خلاف زور قلم دکھایا۔ حیرت ہے کہ ابھی دو سال پیشتر جب محترمہ اردو افسانہ نگاری کا جائزہ لینے بیٹھی تھیں تو کرشن چندؔر انہیں افسانہ نگاری کا دیوتا نظر آتا تھا اور اس کے روی سے روی افسانہ میں بھی وہ وہ باریکیاں دیکھتی تھیں اور ایسی ایسی تشریحیں کرتی تھیں کہ بے چارہ افسانہ نگار "مصنف سوچتا ہے کہ کس کی یہ تصنیف ہے" کا مصداق ہو کر دانتوں میں انگلیاں دبا کر رہ جاتا تھا اور پیراں نمی پرند مریداں می پرانند کا مضمون تھا۔ لیکن ترقی پسند تحریک سے الگ ہوتے ہی انہیں کرشن چندؔر کے "اَن داتا" میں بھی کیڑے دکھائی دینے لگے' حالانکہ اس سے پیشتر مختلف پہلوؤں سے وہ اس پر قصیدہ خوانی کر چکی تھیں مگر اب نہ معلوم ادب میں کایا پلٹ ہو گئی یا وہ خود کایا کلپ ہو گئیں کہ ترقی پسند فنکاروں کی تمام کوششیں سرے سے مہمل اور بے جان نظر آنے لگیں اور اس کے

اظہار کے لئے وہ مواقع کی تلاش میں اس درجہ سرگرم ہو گئیں کہ مناسب اور نامناسب کی تمیز بھی کھو بیٹھیں۔ شیریں جیسی صاحب فکر و نظر سے ہمیں امید اس چیز کی تھی کہ وہ اپنی اعلیٰ و ارفع استعداد کے مطابق سنجیدگی کے ساتھ "یا خدا" کا جائزہ لیں گی اور اپنے تبحیر علمی کے شایان شان تنقید کریں گی، "شیر شاہ کی بڑی یا سلیم شاہ کی بڑی" کا مقابلہ تو یوں بھی تنقید میں کوئی مستحسن چیز نہیں ہے دیباچوں اور تبصروں کو ادبی پالی بنانا کوئی ادبی خدمت نہیں ہے۔ خیر ہر شخص کو اپنے قول و فعل کا اختیار ہے۔ انہیں اس کی قطعاً آزادی ہے کہ وہ اپنی پچھلی چھ سالہ ادبی خدمت کا گلہ گھونٹ کر ایم اسلم اور قیسی رامپوری کو بیدی اور کرشن چندر پر فضیلت دیں، مگر قدرت اللہ شہاب کو اس اکھاڑے میں اتار کر بیدی اور کرشن چندر سے بھڑانا اصولی طور پر غلط ہے۔ انہوں نے قدرت اللہ شہاب کو عقیدت کے ہار پہنا کر اور "یا خدا" کا کچھ مطلب "سعدی دیگر است" قسم کا دیباچہ لکھ کر شہاب کے ساتھ ٹھیک نادان دوست والی دشمنی کا ثبوت دیا ہے اور ذاتی اغراض کی بنا پر ایک عظیم فنکار کو آلہ کار بنایا ہے آپ کی غرض پوری ہو یا نہ ہو مگر فنکار کا مطلب تو بگڑ ہی جائے گا۔ اس بنا پر میں ان تمام لوگوں کو دعوت دیتا ہوں جو ادب کا خلوص کے ساتھ مطالعہ کرتے ہیں کہ وہ "یا خدا" کا جائزہ لیں۔

ترقی پسند ناقدین سے دست بستہ عرض کرتا ہوں کہ وہ "یا خدا" یا "یا خدا" ایسی اور چیزوں کو تبصروں اور دیباچوں کے سرٹیفکیٹ دیکھے بغیر بھی پڑھا کریں اور انہیں قدرت اللہ شہاب کا یہ شہ پارہ ممتاز شیریں اور عسکری کے دیباچہ اور تبصرہ کے لیبل ہٹا کر پڑھنا چاہئے تھا۔ انہیں معلوم ہوتا کہ قدرت اللہ شہاب کم از کم "یا خدا" تک تو انہی کا ہم نوا ہے اور اس کا مقام انہی کی صف میں ہے اور ممتاز شیریں سے انہی سے ٹکرانا چاہتی ہے اور اسے کرشن چندر اور بیدی کی قطار سے ایم اسلم اور قیسی رامپوری کی صف میں گھسیٹ رہی ہیں۔ یہاں پر مجھے ان ترقی پسند ناقدین سے شکایت ہے کہ انہوں نے "یا خدا" پر صرف اس لئے کہ اس پر ممتاز شیریں کا دیباچہ تھا اس کی سب خوبیوں پر پانی پھیر دیا اور جذباتیت اور ہٹ دھرمی میں جو فیصلہ صادر کیا وہ نہ صرف علمی و ادبی بددیانتی ہے بلکہ ترقی پسند اصولوں کے سخت منافی ہے۔ یہ لوگ اس سے پیشتر فسادات نمبر میں "یا خدا" دیکھ چکے ہوں گے اور ممکن ہے کہ پسند بھی کر چکے ہوں گے۔ مگر ان بے چاروں کو

اس پر تنقید کرنے کی ضرورت اس وقت محسوس ہوئی جب اس میں ممتاز شیریں کا مقدمہ شامل ہوا' اسی کو پرائی بدشگونی کے پیچھے ناک کاٹنا کہتے ہیں۔

آخر میں پھر عرض کروں گا کہ اس میں شک نہیں کہ "یا خدا" کا دیباچہ ایک قسم کی سازش کا پہلو لئے ہوئے ہے مگر اس کی بنا پر اصل شہ پارہ کی عظمت سے منکر ہونا اور نہ صرف منکر ہونا بلکہ اس کی خوبیوں کو برائیوں کا نام دینا خود اس ادبی بددیانتی کے ارتکاب سے کم نہیں جس سے دیباچہ کی تیاری میں کام لیا گیا ہے اور مجھے رجعت پسند دیباچہ نگار کی صف میں ان "ترقی پسند" تبصرہ نگاروں کو بھی کھڑا کرنا پڑتا ہے۔

ارے صاحب ترقی پسندی کا تقاضا تو یہ تھا کہ دیباچہ نگار کی سازش کو بے نقاب کیا جاتا اور "یا خدا" کے مصنف کے متعلق یہ بتایا جاتا کہ کم از کم "یا خدا" تک تو ہماری انجمن کے اصولوں کا سچا ترجمان ہے۔ بہتر یہ کہ اسے اب ایک خاص مقصد کے لئے Exploit کیا جا رہا ہے۔ چلتے چلتے مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ دیباچہ نگار اور تبصرہ نگار اپنے اپنے رویّہ پر غور کریں۔ خصوصاً تبصرہ نگار حضرات جو انجمن ترقی پسند مصنفین کے افراد ہیں ذرا اسپورٹنگ سپرٹ سے کام لیں اور "یا خدا" کو انصاف کے ساتھ پڑھیں اور پھر اپنے تبصروں کو' اور ممتاز شیریں اور عسکری کے اظہارِ خیال کرنے کے قصور "یا خدا" سے معاف کر کے دوبارہ تبصرہ لکھیں' یوں تو تنقید میرا میدان نہیں ہے' اور اس میدان میں راقم الحروف نو وارد سے زیادہ نہیں اس لئے قدرت اللہ شہاب جیسے عظیم فنکار اور یا خدا جیسے بے مثل شہ پاروں کے شایانِ شان نہ لکھوں گا اور قرار واقعی تنقید نہ کرنے کا حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا۔ لیکن اگر میری اس تحریر پر مصنف' دیباچہ نگار اور تبصرہ نگار حضرات میں سے کوئی غور کریں گے تو میں اپنی سعادت خیال کروں گا اور اردو ادب کے لئے نیک فال۔

ابوالفضل صدیقی کا یہ مضمون قدرت اللہ شہاب کی تصنیف "یا خدا" پر پہلا تنقیدی مقالہ نہیں ہے اس سے پہلے بھی اس طویل افسانے پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور ملک کے کئی ممتاز نقاد اپنے تنقیدی اصولوں کی روشنی میں اس کا جائزہ لے چکے ہیں مگر ستم ظریفی یہ ہے کہ اب تک جتنی تنقیدیں ہماری نظر سے گزری ہیں ان میں تصنیف پر تنقید

کرنے کی بجائے ضمنی مباحث کو زیادہ نمایاں کرنے کی کوشش کی گئی ہے بلکہ یہ کہنا کچھ غلط نہیں ہے کہ تنقیدی مقالے کے لئے جس غور و فکر اور سنجیدگی کی ضرورت ہوتی ہے اس کا مظاہرہ ابھی تک "یا خدا" کے غالباً کسی نقاد نے بھی نہیں کیا۔ بعض تنقیدیں پڑھ کر تو قاری اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ محترم نقاد "یا خدا" پر نہیں "یا خدا" کے دیباچے اور دیباچہ نگار کے تنقیدی رجحانات پر تنقید کر رہے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ کسی کتاب کے دیباچے پر بحث کرنا کوئی معیوب بات نہیں مگر اصل کتاب کا متن نظر انداز کر کے سب کچھ دیباچے کو سمجھ لینا یا دیباچہ پڑھ کر ایک خاص رائے قائم کرنے کے بعد اس رائے کی روشنی میں تصنیف کے محاسن و عیوب کو پرکھنا ایک باشعور ادیب و نقاد کے لئے کسی طرح بھی جائز نہیں اور ایک ذمے دار نقاد کے شایانِ شان نہیں ہے کہ وہ دیباچے سے اس درجہ متاثر ہو جائے کہ تصنیف پر سنجیدگی کے ساتھ غور و فکر ہی نہ کر سکے۔

صدیقی صاحب نے اپنے اس مقالے میں تنقید کو تین حصّوں میں تقسیم کر دیا ہے۔
پہلے حصے میں انہوں نے "یا خدا" کے مصنف قدرت اللہ شہاب کی ادیبانہ عظمت پر اظہار خیال فرمایا ہے۔

دوسرا حصّہ "یا خدا" کی ہیروئن سے متعلق ہے۔

تیسرے حصّے میں انہوں نے کتاب کے دیباچے کا ذکر چھیڑ دیا ہے اور نقادوں سے اپیل کی ہے کہ وہ "نیا دور" کی مدیرہ کے مضمون سے متاثر ہوئے بغیر کتاب کا مطالعہ کریں تاکہ وہ صحیح معنی میں اس کی خوبیوں کے قائل ہو سکیں۔

صاحبِ مقالہ نے جو فرض اپنے ذمہ ڈالا تھا وہ صرف یہ تھا کہ "یا خدا" کا جائزہ لیں اور تمام تفصیلات کے ساتھ اس کتاب کی عظمت واضح کریں مگر اپنے مضمون میں جس چیز پر انہیں بحث کرنا تھی اس کا ذکر تو نہایت محدود ہو کر رہ گیا ہے مگر دوسری باتیں پھیلتی چلی گئی ہیں اور وہ بھی جذباتی انداز میں!

مقالہ نگار نے اس بات پر زور دیا ہے کہ نقاد اور دوسرے لوگ "یا خدا" کے دیباچے کا کوئی اثر قبول نہ کریں اور کتاب پڑھ کر اس کی خوبیوں کو سمجھنے کی کوشش کریں مگر خود انہوں نے دیباچے اور اس سلسلے میں دوسری باتوں کا ذکر کئی طویل پیراگرافوں میں پھیلا دیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے وہ خود بھی دیباچے سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے اور پھر

انہیں اپیل کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ ایک نقاد اس طرح جذباتیت سے مغلوب نہیں ہو جاتا!

سچی بات یہ ہے کہ "یا خدا" پر صحیح تنقید ابھی تک نہیں ہوئی۔ غیر متعلقہ امور اس طرح الجھ الجھ کر رہ گئے ہیں کہ کتاب کی اصل سپرٹ ان کے سامنے رہ ہی نہیں سکی!

(ایڈیٹر)

بشکریہ ادب لطیف لاہور۔ اگست 1950ء

نظر سے خوش گزرے

یہ بہت پہلے کی بات ہے' شاید 1959ء کی

تب میں پانچویں جماعت کا طالب علم تھا کہ والد صاحب ایک چھوٹی سی کتاب لائے۔ اور میں نے دیکھا کہ اسے پڑھتے ہوئے انہوں نے بے اختیار رونا شروع کر دیا۔

اس کے بعد موقع ملتے ہی میں نے وہ کتاب ان کی الماری سے اڑائی اور پڑھنا شروع کر دیا۔ چھوٹی سی کتاب تھی' گھنٹہ بھر میں ختم ہو گئی مگر اسے پڑھ کر مجھے رونا نہیں آیا۔

چار سال قبل مَیں نے یہ کتاب دوبارہ پڑھی تو آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

تب' ایک دم' جیسے بجلی چمکتی ہے' مجھ پر انکشاف ہوا کہ یہ کتاب اس وقت رُلاتی ہے جب آپ کا شعور پوری طرح بالغ ہو چکا ہو' اس کتاب کا نام "یا خُدا" تھا اور اس کے مصنف تھے قدرت اللہ شہاب! قدرت اللہ شہاب' جو ایک زمانے میں انڈین سول سروس کے ستون تھے' پھر سی ایس پی کے کافی بلند پایہ ستون رہے' آج کل ممتاز مفتی کی معیت میں تصوّف کے ایک پورے' سلسلہ "شہابیہ" کے بانی مبانی بنے ہوئے ہیں۔ نستعلیق کتابی چہرے پر نیم متشرع سی ڈاڑھی بھی بڑھالی ہے۔ یہ الگ بات کہ صوفیوں کی متداول عادت کے برعکس اب وہ مزید نرم دل' مزید آہستہ گو ہو گئے ہیں'

آج کل انہیں دیکھ کر' ان کی باتیں سن کر' بے اختیار صائب کا یہ شعر یاد آ جاتا ہے کہ ۔

فروتنی است دلیلِ رسید گانِ کمال
کہ چوں سوار بہ منزل رسد، پیادہ شود

ان میں اتنی عاجزی اور انکسار ہے کہ لگتا ہی نہیں، یہ شخص کبھی بہت زبردست اور معرکے کا سرکاری افسر بھی رہا ہو گا۔ نرم دمِ گفتگو، گرم دم جستجو، رزم میں تو ہم نے دیکھا نہیں. مگر بزم میں وہ پاک دل و پاک باز ہی محسوس ہوئے۔

وہ ساری عمر اپنے متعلقین اور وابستگان کو حیران ہی کرتے رہے، تب بھی جب صدرِ پاکستان کے سیکرٹری تھے، تب بھی جب اطلاعات کے سکتر تھے، اور تب بھی، جب نوکری چھوڑ کر یونیسکو میں جا بیٹھے، اور ایک روز پتہ چلا کہ خفیہ طور پر وہ اسرائیل کا چکر بھی لگا آئے ہیں۔ تب ان کے ایک مرحوم دوست ابن انشآ نے جو کالم لکھا، اس کی سُرخی یہ شعر تھا۔

قدرت اللہ شہاب کی باتیں
ایسے ہیں، جیسے خواب کی باتیں!

باتیں وہ اب بھی خواب و خیال ہی کی سی کرتے ہیں، یقین نہیں آتا کہ مثنوی کے مصرعہ جیسی دھان پان قامت میں ایسی قیامت کی شخصیت چھپی ہوئی ہے، ان کی قامت مختصر، مگر داستان طویل ہے، اس میں طوفان کی شورش بھی ہے اور جذبوں کی یورش بھی۔

گئے دنوں، گئے زمانوں سے ہم نے کبھی کچھ نہیں سیکھا، یہ داستان بھی بلا سے کوئی اثر مرتب نہ کرے مگر سُن تو لیجئے کہ اس میں کتنی عبرتیں، کتنی قیامتیں پنہاں ہیں، قدرت اللہ شہاب کی کہانی، خود انہی کی زبانی ----

من آنچہ شرط بلاغ است، باتومی گویم
تو خواہ از سخنم پند گیر و خواہ ملال

اظہر سہیل

(بشکریہ نوائے وقت لاہور، راولپنڈی، ملتان اور کراچی، میگزین سیکشن 29 مارچ تا 4 اپریل 85ء)